DUE DATE

Cl. No. ________ *Acc. No.* ________

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

گنگ و جمن



LATE SAJJAD ZAHEER
1905 — 1973

Sajjad Zaheer Number

Rs. 5-00

★

JUNE/AUG. 1976
VOL. I. NO. 8-9-10

MONTHLY
Gang-o-Jaman

بلند پایہ صحت مند ترقی پسند ادب کا ترجمان

گنگ و جمن

کانپور

ادارہ تحریر و مشاورت

• کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
• ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی
سید محمد طاہر کاظمی
• چندر بھان گم راحت

ایڈیٹر

پیام فتحپوری

منیجنگ ایڈیٹر

کرتار سنگھ گیانی گویا

جلد نمبر ۱ — شمارہ نمبر ۸/۹/۱۰

جون، جولائی، اگست ۱۹۷۶ء

شرح چندہ

سالانہ اندرون ملک — پچیس روپے
بیرون ملک — ۵۰ شلنگ
لائف ممبر اندرون ملک ۲۵۰/- روپے
لائف ممبر بیرون ملک ۵۰۰/- شلنگ

قیمت سید سجاد ظہیر نمبر
پانچ روپے

فون نمبر
67270

ماہنامہ گنگ و جمن پوسٹ بکس نمبر 175 کانپور

سجاد ظہیر نمبر

فہرست

گنگ و جمن میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ایڈیٹر کا ان خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

سجاد ظہیر نمبر

ترتیب

سردار کرتار سنگھ گیانی گوپا مینجنگ ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے رزاقی پریس
ٹپکا پور کانپور سے چھپوا کر دفتر گنگ و جمن فلیٹ نمبر 16 نوین مارکیٹ
دی مال کانپور 208001 سے شائع کیا

اداریہ

سجاد ظہیر کی شخصیت مختلف رنگوں کا امتزاج تھی وہ دُنیائے سیاست اور دنیائے ادب دونوں کیلئے نئی زندگی کا پیغام لائے تھے۔ وہ وسیع القلب اور وسیع النظر انسان تھے۔ اُن کی وسیع النظری نے ہی انہیں سیاست و ادب کی پُرکشش شخصیت بنا دیا تھا۔ تاریخ ادب میں اُن کا نام اس لیے ہمیشہ زندہ رہے گا کہ انکی ترقی پسند ادب کی تحریک نے نہ صرف نئی زندگی کی نئی منزلوں، سمتوں کا عرفان کرایا بلکہ زندگی کی بنیادی اور مستقل قدروں سے ادب کا رشتہ جوڑ دیا۔ ادب برائے زندگی کی اس تحریک نے ادب کے ذریعہ زندگی کو بنانے سنوارنے کے عظیم مقصد سے ہم آہنگ کیا۔ نئی نسل کے شاعروں اور ادیبوں کو متحرک کیا۔ نئی راہوں اور نئی منزلوں اور نئی جہتوں سے روشناس کرایا جس کے نتیجہ میں اردو ادب کا شمار دنیا کے بہترین عالمی ادب میں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اردو ادب کا رشتہ عالمی ادب کی تحریکوں سے بھی جوڑ دیا!

انہوں نے نہ صرف اردو کے شاعروں ادیبوں کو اس تحریک کے رشتے میں پرو دیا بلکہ ہندوستان کی مختلف مروجہ زبانوں کے شاعروں ادیبوں کو عمل و اتحاد کے ذریعہ ایک دوسرے کے قریب کیا اور اس طور پر وہ مختلف زبانوں کے شاعروں، ادیبوں کے مقبول ترین رہنما تھے انکی تحریک ملک گیر تھی۔ یہ ہمہ گیری اور مقبولیت سجّے بھائی کے علاوہ اور کسی ادیب کے حصہ میں آج تک نہیں آئی۔

ان ہی خصوصیات سے متاثر ہوکر ادارہ گنگ جمن نے سجاد ظہیر نمبر نکالنا اپنا فرض جانا۔ سجاد ظہیر نمبر ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے جو آپکی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اس نمبر میں ہندوستان و پاکستان کے اہم اور مایہ ناز شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں جو ضخیم نہ ہونے پر بھی ایک اہم تاریخی ادبی دستاویز کی حیثیت سے دلوں پر اپنا نقش چھوڑے گا +

ہم سجاد ظہیر نمبر ۳۰۰ صفحات کا نکالنا چاہتا تھا مگر ہمیں افسوس ہے کہ بعض احباب اور رفیقوں نے جن سے کہ خاص امیدیں وابستہ تھیں وعدہ کرنے کے بعد بھی ہمارے ساتھ اشتراک عمل نہیں کیا ہمیں ایسے دوستوں سے شدید شکایت ہے۔ ہمارے رفیق کار پیام بھائی ۲۰ جولائی سے بستر علالت پر ہیں اس لیے ان کا مقالہ بھی شامل اشاعت نہ ہو سکا۔ پھر بھی انہوں نے بیماری کے باوجود اس خاص نمبر کی تیاری میں انتہائی جانفشانی سے کام لیا +

آخر میں ہم ان تمام قلمکاروں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنہوں نے قیمتی تخلیقات سے ہمیں خاص نمبر نکالنے کی عزت بخشی +

کرتار سنگھ گیانی گویا

راج بھون
نینی تال ۵ جون ۱۹۷۷ء

گورنر
SEAL
اتر پردیش

کرمی کرتار سنگھ جی

آپ کا خط مورخہ ۳۰ مئی موصول ہوا۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ "گنگ وجمن" کا سید سجاد ظہیر نمبر بہت جلد شائع کرنے جا رہے ہیں۔

سجاد ظہیر ادب اور سیاست کی دنیا میں ایک ممتاز مقام کے مالک تھے ان کا تعلق اودھ کے ایک خوشحال اور پڑھے لکھے خاندان سے تھا وہ بیرسٹری پاس کرکے جب لکھنؤ واپس آئے تو پنڈت نہرو کی پرکشش شخصیت نے اُن کے اوپر جادو کا کام کیا۔ وکالت چھوڑ دی اور آنند بھون الہ آباد کے اندر بیٹھ کر سیاسی افکار میں مبتلا ہو گئے۔ وہ اشتراکی خیال کے حامی تھے پھر بھی مہاتما گاندھی کو اپنا سیاسی گرو مانتے تھے۔ انھوں نے ترقی پسند شعرا اور ادیبوں کو جمع کیا اور ان کے اندر بدیسی سامراج کے خلاف جنگ کرنے کا زبردست جذبہ پیدا کیا اور انکی رہنمائی کی۔ اس سلسلہ میں ان کو بار بار جیل بھی جانا پڑا۔ مگر اپنے ملک کو کبھی نہ چھوڑا۔ وہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے اتحاد پر زور دیتے تھے۔ اس کام میں بڑی حد تک وہ کامیاب ہوئے اردو ادب کی انھوں نے بڑی خدمت کی۔ انکی کتابیں "لندن کی ایک رات" "ذکر حافظ" اور "پگھلا نیلم" خاص طور پر قابل ذکر ہیں

وہ صرف بھارت ہی میں نہیں بلکہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ادبی حلقوں میں شہرت یافتہ تھے اور اکثر بین الاقوامی کانفرنسوں میں اپنے ملک کی نیابت بھی کی تھی۔ سجاد ظہیر ہمیشہ شرافت، رفاقت اور روحانی سرفرازی کی تلاش پر زور دیتے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ ایک سیاسی اور ادبی شمع ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی پھر بھی ان کے افکار اور اثرات ہماری سیاسی اور ادبی دنیا پر ہمیشہ کارفرما رہیں گے۔

میں آپ حضرات کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ حضرات سید سجاد ظہیر کی یاد میں "گنگ وجمن" کا خصوصی شمارہ شائع کرتے جا رہے ہیں!

میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں

مخلص
ایم چنا ریڈی

SEAL

چیرمین اتر پردیش کونسل
لکھنؤ

پیارے گویا صاحب

آپ کا خط ملا ہے یہ جان کر انتہائی مسرت ہوئی
کہ آپ گنگ و جمن کا سید سجاد ظہیر نمبر نکال رہے ہیں۔
سید سجاد ظہیر صاحب اردو ادب کے نامور ادیب تھے
انھوں نے اردو ادب کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں قابل تحسین
اور یاد رکھنے کے لائق ہیں
میں اس مبارک موقع پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں
اور سجاد ظہیر نمبر کی کامیابی کے لئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار
کرتا ہوں

ویریندر سروپ

عمار رضوی
وزیر
تعلیم و پارلیمانی امور

ودھان بھون
لکھنؤ
مورخہ
جولائی ۱۹۷۶ء

محترمی گویاؔ صاحب
آداب عرض

آپ کا خط مورخہ ۸ رمئی ۱۹۷۶ء وصول ہوا! مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ آپ ماہنامہ "گنگ وجمن" کا سجاد ظہیر نمبر شائع کر رہے ہیں

سجاد ظہیر کا شمار اردو ادب کے صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے ذریعہ اردو ادب کو مالا مال کیا۔ مجھے توقع ہے کہ آپ کی مساعی جمیلہ سے "گنگ وجمن" کا سجاد ظہیر نمبر ادبی اعتبار سے ایک اہم شمارہ ہوگا!

مخلص

عمار رضوی

بہاراں کا سفیر!

مجروح سلطانپوری

دوستو پھینک دو اب ہاتھ سے قرطاس و قلم — ناخنِ غم سے کرو لوحِ جگر پر تحریر
نقشِ غم! روزِ ازل سے ہے جو میراث اپنی — اپنا سرمایہ یہی غیرتِ نگرِ مانی تصویر
زنِ انجم پہ نہیں دیدۂ حیراں سے کہو — ذرۂ خاک پہ لکھی ہے بشر کی تقدیر
سوچتا ہی نہیں کچھ تو ہی بتا دیدۂ تر — ظلمتِ خاک میں غلطاں ہے یہ کس کی تنویر
آہ وہ ہاتھ کہاں ہے کہ اسے چوم تو لیں — جس کے اک جام سے میخانے ہوئے ہیں تعمیر
چمنِ دہر سے کانٹوں کی ردا اوڑھے ہوئے — کون سے دیس سدھارا وہ بہاراں کا سفیر

خاک رخسار پہ مل اے گلِ خورشیدِ سحر
توڑ دے آئینۂ شام کو اے ماہِ منیر

لے گیا دستِ اجل چھین کے دیوانوں سے — ایسا غمخوارِ جنوں روئے گی جس کو زنجیر
خامشی اس کی تبسم ہی تبسم تھی گویا — بیقراروں کو گھنی چھاؤں تھی اسکی تقریر
بھر گیا لالہ و گل سے جسے جانے والا — اب وہی راہ گذر لگتی ہے زخموں کی لکیر
شاید آوارہ کرے اور ابھی خوابِ سحر — گردِ مژگاں ہی رہے خوابِ سحر کی تعبیر
نقشِ دیوار سے خاموش ہیں اربابِ سخن — صورت افسردہ ہے الفاظ و معانی دلگیر

اشک آلودہ ہوئی میری غزل اس کے بعد
نام نغمے کا ہوا نوحۂ سجاد ظہیر

٭

سجّاد ظہیر

از نشور واحدی

به زه افتادگاں را دستگیرے | ندیدیم هم چو سجادِ ظهیرے
گروه مختلف بر اعتمادش | همه خلقت به زلف اُو اسیرے

به دولتگاه دهلی کج کلاهے | به خاک کوئے میخانه فقیرے
به عالم با همه هم بے همه بود | جهانش خود گزارے خود پذیرے
کمانے داشت از خلق و محبت | شکار اُو نخورده زخم تیرے
گلے از گلشنِ ساداتِ مشرق | شکستِ دورِ شاهاں از وزیرے[1]
به میخانه امام بت تراشاں | به مسجد هم چو عابد بر حصیرے
به نوکِ خامه نقّاشِ حقائق | در افسانه نگاری بے نظیرے

جنبش از صباح نَو منوّر
ز خورشید عوامی تاب گیرے

نشور واحدی

[1] ان کے والد کا نام سر وزیر حسن تھا جو اطراف جونپور کے باشندہ تھے۔

سجاد ظہیر رزم اور بزم کا ساتھی

فیض احمد فیض

بنے کی شخصیت بڑی پہلودار اور تہہ دار تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اتنی جامع بھی تھی کہ بہت جلد انکی حیثیت ایک معروف بے مثال اور صاحب امتیاز مظہر کی ہو گئی ــــ ہمارے دور کے سیاسی ادبی اور دانشورانہ حلقوں کی ایک محبوب ترین اور مقبول ترین شخصیت تھی ۔ صحافت کے علاوہ ادب میں بھی انھوں نے تحریروں کا اچھا خاصہ ذخیرہ ، کہانیاں ، ڈرامے ، نظمیں ، تنقیدی مضامین یادگار چھوڑے ہیں ، انکی تحریریں قابل قدر ہیں لیکن انھوں نے عہد حاضر کی دانشورانہ اور ادبی زندگی میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں ان میں انکی نگارشات سے زیادہ ان کا اثر اور انکی وجدان آفریں صلاحیت کو اہمیت حاصل ہے اور یہ اثر اتنا گہرا ہے اور اس قدر رچا بسا ہوا ہے کہ اسے الگ کر کے دیکھنا ممکن ہی نہیں انھوں نے کبھی دانشورانہ یا نظریاتی عظمت کا رعب نہیں جمایا دوسروں پر اپنی رائے نہیں مسلط کی سچ یہ ہے کہ میں جن لوگوں کو جانتا ہوں ان میں کم ہی سے اتنا دور کسی کو نہیں پایا جتنا بنے تھے ۔

وہ بڑوں اور چھوٹوں سب سے برابر والی کی حیثیت سے بات کرتے تھے لیکن ان کا انداز چھوٹوں کے ساتھ سرپرستی کا ہوتا تھا نہ بڑوں کی دل آزاری کرتے تھے وہ محبت اور دوستی کے ذریعہ حکمرانی کرتے تھے ، مسکراہٹ سے دوسروں کو قائل کرتے ، دوستانہ معانقے کے ذریعہ متاثر کرتے تھے !

لیکن اس ساری انکساری اور شرافت طبع کے باوجود ارادے کے پکے بڑے پر عزم اور اصولوں کے لئے بڑے استوار مجاہد تھے !

دوستی میں ، اپنے سیاسی یقین میں اپنے ادبی اصول میں اپنے طرز زندگی میں وہ بڑے ثابت قدم اور وفادار تھے !

آج سب سے زیادہ انکی دائمی مسکراہٹ یاد آتی ہے جو اچھے وقتوں میں برے وقتوں میں خوشی کے لمحوں میں اور مشکلوں مصیبتوں کے دنوں میں ہر حال میں ان کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی تھی اور پھر انکی خوش گفتاری اور فیاضانہ شفقت و محبت یاد آتی ہے جب وہ کسی محفل میں آجاتے تھے تو لگتا تھا وہاں ایک شمع روشن ہو گئی ہے

فیض

پنڈت
آنند نرائن ملا

ترقی پسند ادب کا قافلہ سالار

ترقی پسند تحریک ۱۹۳۲ء میں ایک چھوٹی سی کتاب انگارے کے ملبے سے پہونچی اس کے شائع ہوتے ہی ادبی حلقوں میں ایک ہلچل مچ گئی اکثر بزرگ ادیبوں کا خیال تھا کہ اس کتاب سے نوجوان ادیب گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ ادیب وہ تھے جو اس بات کو نظر انداز کرتے تھے کہ ادب اور زندگی دونوں میں جمود کی گنجائش نہیں۔ وہ موجودہ قدروں کو دل سے لگائے ہوئے تھے اور نئی قدروں کو بغاوت کہتے تھے

لیکن ان بزرگوں کے احتجاج کے باوجود "انگارے" کے ترقی پسند ادیبوں نے ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا پہلی بات جوان ادیبوں میں سب سے زیادہ نمایاں تھی وہ یہ کہ یہ لوگ مغربی ادب سے بھی واقف تھے اور شاید ضرورت سے زیادہ مغربی ادب سے متاثر تھے ان میں ایک جوش تھا ولولہ تھا اور وہ توازن نہ تھا جو اس وقت موجود ہے اس جوان ترقی پسند گروہ میں سب سے زیادہ تابناک شخصیت سجاد ظہیر کی تھی جس طرح انگریزی ادب میں کولرج کو اپنے دور کا رہنما کہا جاتا ہے اسی طرح سجاد ظہیر کو ترقی پسند ادب کا قافلہ سالار قرار دیا جا سکتا ہے

سجاد ظہیر کی شخصیت میں ایک جادو تھا جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا میں ان سے عمر میں کئی سال بڑا ہوں لیکن مجھے یاد ہے جب انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا جلسہ رفاہ عام کلب میں ہوا تو وہ مجھے اودھ جم خانہ کلب سے پکڑ کر لے گئے انھیں کے اصرار پر میں نے ایک نظم سنائی جس کا عنوان تھا "بیسوا" یہ نظم اسی زمانہ میں کہی گئی تھی

سجاد ظہیر انسانی اعتبار سے کافی لطیف تھے ان میں یہ کمال تھا کہ وہ شدید اختلافات کے باوجود کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے وہ اختلافات کو ہمیشہ ذہنی سطح پر رکھتے تھے اور اصول کے تحت اپنے خیالات پیش کرتے تھے اس کے علاوہ وہ اتنے مہذب اور خوش مزاج انسان تھے کہ بڑی آسانی سے سخت باتیں بھی برداشت کر جاتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ ان کے گرد اس قدر محبت کے ساتھ جمع ہو جاتے تھے اور ان کی رہنمائی قبول کرتے تھے سجاد ظہیر ذہنی اعتبار سے تمام ترقی پسند ادیبوں سے آگے تھے ان کا شعری مجموعہ پگھلا نیلم میں تخیل اعتبار سے جدت بہت ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ شعر سے بہتر نثر لکھتے تھے اور اگر باقاعدہ افسانہ اور تنقید بھی لکھتے رہتے تو اور بھی اونچی جگہ حاصل کر سکتے تھے پھر بھی انھوں نے جو لکھا ہے اس میں وہ ساری چنگاریاں موجود ہیں جو ایک بڑے فن کار کی تخلیق میں ہوتی ہیں لیکن ایک تنظیم کار کی حیثیت سے ان کی گوناگوں مصروفیتوں نے ان چنگاریوں کو شعلہ جوالہ نہیں بننے دیا پھر بھی ان کی تحریروں میں ایسے خزانے موجود ہیں جو آج بھی اکثر سوالات کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں ۔

گذارش

افسانہ نگار، شاعر، مضمون نگار حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اپنی تخلیقات صاف اور خوشخط بھیجیں تاکہ ادارہ کو اسکی اشاعت میں آسانی ہو

ترقی پسند ادب کا رہنما

غلام ربانی تاباں

یوں تو بنے بھائی کی کئی حیثیتیں تھیں وہ ادیب تھے، کمیونسٹ پارٹی کے اہم کارکن تھے اور ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانی تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ اچھے انسان اور اچھے دوست تھے۔ وہ شرافت، محبت اور مروت کے پیکر تھے۔ اُن کا دل بہت بڑا تھا اُن کے دل میں دوستوں کے لئے بے پناہ پیار تھا۔ وہ سب سے پیار کرتے تھے سب کے ہی خواہ تھے ان کے دل میں کدورت کے لئے گنجائش ہی نہ تھی۔ کبھی کبھی انہیں بھی شکایت ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن وہ اُسے دل میں نہیں رکھتے تھے پہلی ملاقات میں صاف صاف کہہ دیا کرتے تھے شکایت کرتے وقت ان کے لہجے میں شگفتگی ہوتی تھی دھیمے دھیمے انداز میں اپنی بات کہتے اور اس کے بعد ان کا دل صاف ہو جایا کرتا تھا وہ اسی انداز سے ملنے لگتے تھے۔

بنے بھائی شعر کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے۔ فارسی اور اردو ادب پر اُن کی بڑی اچھی نظر تھی۔ حافظ ان کا محبوب شاعر تھا کبھی موڈ میں ہوتے تو حافظ کے شعر پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے۔ پھولوں سے انہیں عشق تھا جس زمانہ میں مکتبہ جامعہ کا میں جنرل منیجر تھا میں نے مکتبہ کے باغ میں بہت سے گلاب لگائے تھے۔ سردی کا موسم آتا گلاب کھلتے میں بنے بھائی کو فون کرتا پھولوں کو آپ سے بڑی شکایت ہے کہ آپ ابھی تک انہیں دیکھنے نہ آئے۔ اس کے بعد ممکن نہ تھا کہ دو ایک روز میں وہ نہ آئیں جب آتے تو خاصہ وقت گلابوں کے تختے میں صرف کرتے جس سال پھول اچھے نہ آتے مجھے ڈانٹ کھانی پڑتی "تم پودوں کی دیکھ بھال نہیں کرتے ہو۔ گلاب ذاتی توجہ چاہتا ہے۔ مالی پر اس کی نگہداشت نہیں چھوڑی جا سکتی" ان کا جمالیاتی ذوق بڑا نکھرا ہوا تھا، موسیقی، رقص، مصوری شاعری غرضیکہ تمام فنون لطیفہ سے انہیں گہری دلچسپی تھی ان میں تمام وہ اوصاف موجود تھے جن کی بنا پر مکمل شخصیت وجود میں آیا کرتی ہے! مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن غالباً سنہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے کہ دلی میں خاصہ بڑا زلزلہ آیا تھا۔ بنے بھائی اُس رات میرے مہمان تھے کھانے کے بعد ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ زلزلہ کا ایک شدید جھٹکا آیا جہاں ہم لوگ بیٹھے تھے اس کے اوپر لکڑی کا ایک تختہ لگا تھا جس پر مہاتما بدھ کا مجسمہ رکھا ہوا تھا جھٹکے نے مجسمہ کو ہلا دیا مگر خوش قسمتی سے وہ گرا نہیں ورنہ ہم زخمی ہو جاتے۔ وہ رات بھی قیامت کی رات تھی ہلکے ہلکے جھٹکے آتے رہے۔ تمام رات آنکھوں میں کٹ گئی صبح ناشتہ کے وقت میں نے بنے بھائی سے کہا کہ مہاتما بدھ نے بڑا کرم کیا اگر مجسمہ گر جاتا تو ہم دونوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور شہید ہو جاتا۔ میری بات سن کر حسب معمول مسکرائے کہنے لگے مجسمہ حسین ہے موت بھی حسین ہوتی

غالب نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ کسی کی موت کا غم وہ کرے جسے خود نہ مرنا ہو۔ مجھے بھی مرنا ہے لیکن جب تک زندہ رہوں گا بنے بھائی کی شرافت اور محبت کے نقش قدم دل سے مٹ نہ سکیں گے!

رقصِ شرر

علی سردار جعفری

ساری انسانیت اک تڑپتا ہوا شعلہ ہے
اور افراد چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں میں کتنے ہی بیباک و بیتاب شعلے
مچل رہے ہیں
اس تڑپتے ہوئے شعلے سے
جتنی چنگاریاں چھوٹتی ہیں
اس طرح زندگی
گل بہ آغوش چنگاریوں سے
ہر گھڑی
اک نیا اور مہکتا ہوا ہار اپنے لیے گوندھتی ہے
کچھ تو چنگاریاں ایسی ہیں جو بھڑکتی نہیں تڑپتی نہیں صرف اڑتی ہیں
اور ناچ کر ایک لمحے میں کھو جاتی ہیں
موت کی سرد آغوش میں آکے سو جاتی ہیں
لیکن ایسی بھی کتنی چنگاریاں ہیں اور خار و خس پہ
لپکتی ہیں اور بجھتے بجھتے کبھی دنیا اور انسانیت کو
رنگ اور طوفان کے ایک طوفان میں غرق کر جاتی ہیں
گرمیٔ بزم صرف رقصِ شرر تک نہیں ہے

گلِ عقیدت

سردار جعفری

اے صبا، اک گل تُو مری جانب سے اس دل کیلیے
جس کی دھڑکن میں نہاں تھا نغمۂ عالم کا دل
دشمنوں کے واسطے جو آہن و فولاد تھا
دوستوں کے واسطے تھا قطرۂ شبنم کا دل

سجاد ظہیر ایک ایسی ہی چنگاری تھے جو اب ہم میں نہیں رہے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دفن ہیں جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور خواجہ غلام السیدین جیسے ممتاز اہل علم اور وطن دوست ابدی نیند سو رہے ہیں

میں سجاد ظہیر سے پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء کے دوران دہلی میں ملا تھا جہاں بائیں بازو کی تنظیموں نے ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے خلاف احتجاج کرنے کیلئے ایک جلسۂ عام منعقد کیا تھا ہم دونوں وہاں تقریریں کرنے کیلئے آئے تھے میں اسٹوڈنٹ تحریک کی نمائندگی کر رہا تھا اور وہ کانگریس پارٹی کی یا ہو سکتا ہے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی، جو ان دنوں غیر قانونی تھی!

انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی کی حیثیت سے اور اردو افسانوں کے سنسنی خیز مجموعے "انگارے" کے ایک مصنف کی حیثیت سے سجاد ظہیر مشہور ہو چکے تھے برطانوی حکومت نے رجعت پرستوں اور قدامت پرستوں کے دباؤ میں آکر "انگارے" کو ضبط کر لیا تھا پھر بھی افسانوں کا یہ مجموعہ ہمارے ادب کا ایک موڑ بن گیا تھا۔ سجاد ظہیر نے بھی ایک ہونہار شاعر کی حیثیت سے میرا نام سن رکھا تھا جسے ریڈیکل خیالات رکھنے کے جرم میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا ہم میں فوراً دوستی ہو گئی جو ۳۷ برس، انکی زندگی کے آخری دن تک قائم رہی۔ مجھ پر ان کا پہلا تاثر بہت ہی خوشگوار تھا وہ پر خلوص، مخلص اور نرم گفتار نوجوان نظر آئے ان کے ہاتھ بہت ہی خوبصورت اور حساس تھے۔ قلم یا چمچہ یا پیالہ یا کتاب اٹھانے میں ان ہاتھوں کی دھیمی حرکت سے ان میں ایک خاص کشش پیدا ہو جاتی تھی۔ برسوں بعد ممتاز گجراتی شاعر اُما شنکر جوشی نے مجھ سے ان ہاتھوں کی خوبصورتی کی تعریف کی انھوں نے کہا کہ جب وہ سید سجاد ظہیر سے پہلی بار ملے تو جی چاہا کہ ان کے ہاتھوں کو بس دیکھتے ہی رہیں

مجھے یاد نہیں کہ میں نے انھیں بنّے بھائی کہنا کب شروع کیا۔ وہ مجھ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ پہلی ملاقات کے دو سال بعد پھر ہم یکجا ہوئے میں نے ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لئے دہلی یونیورسٹی چھوڑ دی۔ بنّے بھائی اس زمانہ میں لکھنؤ اور الہ آباد میں رہتے تھے اور ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور ڈاکٹر زیڈ اے احمد کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں کام کرتے تھے جو بنّے بھائی سے خاص طور سے لگاؤ رکھتے تھے۔ بنّے بھائی کے سارے بھائی خوب پیسہ کما رہے تھے لیکن بنّے بھائی نے سیاسی اور تہذیبی کاموں کو ترجیح دی اور انھیں سرگرمیوں کیلئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی ان دنوں کمیونسٹوں کو نئے زمانہ کا اولیا سمجھا جاتا جنھیں اپنی مفلسی پر ناز تھا

اس زمانے میں ہم نے تین چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کیں۔ سجاد ظہیر کا مختصر ناول "لندن کی ایک رات" مجاز کی نظموں کا مجموعہ "آہنگ" اور میرے افسانوں کا مجموعہ "منزل"۔ بعد کو میں نے افسانے لکھنا ترک کر دیا اور پوری طرح شاعری کا ہو رہا ان کتابوں سے مسلح ہو کر ہم ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس میں شرکت کرنے کیلئے دسمبر ۱۹۳۸ء میں کلکتہ جا پہنچے جہاں کرشن چندر پہلی کتاب لیکر آئے تھے۔ ہم شائستہ بنگالی ادیب سدھیندر ناتھ دت کے بنگلے سے گھر میں ٹھہرے تھے جنھوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی وہیں ہماری ملاقات ایک بہت ہی اچھے مگر عالی مزاج شاعر بشنو ڈے اور نوجوان باغی بدھ دیو بوس سے ہوئی ہمیں اصل مسرت اس کی تھی کہ اسی سفر میں ہم جمینی رائے اور انکی تصویروں سے روشناس ہوئے۔ جو ہمارے لئے "دریافت" سے کم نہ تھا انکی تصویر دیکھ کر کسی قدر مبالغہ آمیز خوبصورت بنگالی آنکھوں جیسی ہیں لوک کلا کی جھلک ملتی ہے جو ہماری روح کو بیدار کر دیا۔ کانفرنس کا افتتاح گرودیو ٹیگور کرنے والے تھے جنھوں نے کسی غلط فہمی کے تحت اپنا افتتاحی خطبہ بنگالی میں لکھا تھا اس لئے ڈاکٹر ملک راج آنند اور مجھے یہ کام سپرد کیا گیا کہ ہم ٹیگور سے ملاقات کریں اور یہ درخواست کریں کہ وہ اپنا خطبہ انگریزی میں لکھیں۔ جب ہم انکی قدم بوسی کے لئے شانتی نکیتن گئے تو گرودیو نے کہا کہ انھیں نہ تو نیا خطبہ لکھنے کی فرصت ہے اور نہ جو وہ لکھ چکے ہیں اسے انگریزی میں ترجمہ کرنے کا وقت البتہ انھوں نے چند بنگالی ادیبوں کے نام بتائے جو یہ کام کر سکتے تھے ان میں پروفیسر ہیرن مکرجی کا نام بھی تھا اور پھر اچانک انھوں نے ایک نوجوان بنگالی ادیب کا نام لیا اور جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا کہ خدا کیلئے اس سے میرا خطبہ انگریزی میں ترجمہ کرنے کو نہ کہنا۔ جانتے ہو تم لوگ وہ ۲۳ سال کا ہے اور چالیس کتابوں کا مصنف ہے ہم نے انھیں انکساری کے ساتھ بتایا کہ جو اردو ادیب اس کانفرنس میں

میں شرکت کے لئے آئے ہیں وہ صرف ایک کتاب کے مصنف ہیں

کلکتہ کانفرنس ایک بڑا خوشگوار تجربہ تھی بنّے بھائی وہاں رضیہ کے ساتھ اپنی شادی کے فوراً ہی بعد آئے تھے رضیہ ایک نوجوان دبلی پتلی لڑکی تھیں جنہیں دیکھ کر حافظ کا شعر یاد آتا تھا

آں سیہ چردہ کہ شیرینی عالم با اوست ∗ چشم میگوں، لب خندہ، دل خرم با اوست

ترقی پسند تحریک میں رضیہ کا یہ پہلا دورہ تھا دیکھتے دیکھتے وہ نوجوان دلہن سے رضیہ آپا بن گئیں انہوں نے بھائی کی رفیقۂ حیات نے اپنے گرد ہندوستان کے کونے کونے سے ممتاز ادیب اور نوجوان جمع کر لئے تھے جن لوگوں نے انکی سرپرستی کی ان میں گرودیو، علامہ اقبال جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، وللاتھول اور منشی پریم چند جیسی ہستیاں تھیں

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی پہلے بنّے بھائی گرفتار کئے گئے پھر دسمبر ۱۹۴۰ء میں، میں بھی گرفتار کر لیا گیا اور مجھے لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ جیل میں رکھا گیا بنّے بھائی کے بڑے بھائی ڈاکٹر حسین ظہیر اور کانگریسی لیڈر چندر بھان گپتا کے ساتھ تھا۔ بنّے بھائی سنٹرل جیل میں بند تھے۔ دونوں جیلوں کے بیچ میں ایک دیوار حائل تھی

جس دن میں وہاں پہونچا اسی دن ایک ہمدرد وارڈر نے ایک چھوٹا سا پرزہ لاکر دیا جو بنّے بھائی نے مجھے وہاں بھیجا تھا اور قید خانے میں میرا خیر مقدم کیا تھا۔ اب تحریروں کی آمد و رفت شروع ہوگئی ہے جو عام طور سے ادب اور شاعری کے بارے میں ہوا کرتی تھیں۔ ایک بار ایک تحریر جیلر نے پکڑ لی اس نے کیٹس کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا اور وہ یہ سمجھا کہ کسی بہت بڑی سازش کا نیچو شناخت کا نام ہے اور جب میں نے کتاب کھول کر اُسے دکھائی اور اُسے کیٹس کا ایک سانیٹ پڑھ کر سنایا تب اس احمق نے میری جان چھوڑی پتہ نہیں وہ سانیٹ اسکی سمجھ میں بھی آیا تھا یا نہیں

بنّے بھائی کے لئے اور ہم سب کیلئے خوشی کا عظیم لمحہ جیل خانے سے چھوٹنے کے بعد ۱۹۴۱ء کے اواخر میں آیا آل انڈیا لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ترقی پسند شعرا کا ایک مشاعرہ منعقد کیا یہ اپنی قسم کا پہلا مشاعرہ تھا جسے نوادر شعراء کا مشاعرہ کہا گیا جس میں مجاز، فیض، مخدوم، جاں نثار اختر، جذبی کو اور مجھے شرکت کے لئے مدعو کیا گیا لکھنؤ کے اساتذہ حاضرین میں تھے۔ یہ پروگرام بے انتہا کامیاب ہوا۔ ترقی پسند ادب بالغ ہوگیا تھا

اگلے سال ۱۹۴۲ء میں کامریڈ پی سی جوشی نے جو اس وقت ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے مجھے پارٹی کے اردو ہفتہ وار "قومی جنگ" کے ادارتی عملے میں کام کرنے کیلئے بمبئی آنے کی دعوت دی۔ میں ۱۲ رجون ۱۹۴۲ء کو بمبئی پہونچا چند دنوں بعد بمبئی بنّے بھائی پہونچ گئے اور ہم دونوں نے پارٹی کے پہلے اردو رسالہ کا پہلا شمارہ نکالا یہ ہمارے ساتھ ساتھ رہنے اور کام کرنے کی ایک طویل مدت کا آغاز تھا۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر اشرف بھی آگئے پھر سبط حسن آئے اور پھر کیفی اعظمی، علی اشرف، محمد مہدی، ظ انصاری، علیم اللہ اور بہت سے دوسرے لوگ بھی آگئے

ہم پارٹی کمیون میں رہتے اور کھاتے تھے جس کا نام پتہ نہیں کیوں راج بھون تھا ہماری ماہانہ آمدنی چالیس روپیہ تھی (بنّے بھائی ایک الگ گھر میں مالکیشور روڈ پر رہتے تھے) ہم مضامین لکھتے کاپیاں جوڑتے، انہیں پریس لے جاتے اور جب اخبار چھپ جاتا تو پوری ادارتی ٹیم اخبار فروش بن جاتی اور سڑکوں پر جاجا کر چیخ چیخ کر اخبار بیچتی اس سے عوام پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

پارٹی کمیونسٹ کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی۔ مہاتما گاندھی نے بھی اس کے وجود سے دلچسپی ظاہر کی جن ادیبوں کا پارٹی سے باضابطہ تعلق نہیں بھی تھا وہ بھی آتے اور ہمارے ساتھ چند دن رہتے اور کمیونسٹ رفاقت کا خوش گوار تجربہ ساتھ لیکر واپس جاتے۔ بعض فوج میں بھرتی ہو گئے تھے پھر بھی وہ ایک دن کیلئے آئے۔ مجاز ہمارے ساتھ چند مہینے رہے اور انھوں نے اخبار میں کام بھی کیا۔ انکی اجرت صرف چائے اور کھانا تھی اس سے زیادہ کا انھوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ جوش ملیح آبادی اور سمترانندن پنت کبھی کبھار آجاتے۔ وہ پی سی جوشی کے دوست تھے جوش نے پارٹی کیلئے بہت سی نظمیں لکھیں

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کا دور تھا جو ساری زبانوں پر چھایا تھا اور اس نے ادب کا بہت بڑا اور بہت اچھا ذخیرہ پیش کیا۔ ہندوستان میں اتنی زبردست تہذیبی تحریک اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھی تھی۔ ہماری تحریک آزادی سے اسکی گہری وابستگی تھی۔ ترقی پسند کا لفظ باعث افتخار بن گیا

بنے بھائی کی شخصیت اور ایک بانظریہ تحریک کے بارے میں ان کے تصور کے گرد اردو کے چھوٹے بڑے تقریباً سارے ادیب جمع ہو گئے۔ وہ لوگ بھی جو ہم سے متفق نہیں تھے جیسے جگر مرادآبادی ہمارا بہت احترام کرتے تھے اور بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا کہ قومی جنگ اردو کے نقطۂ نظر سے اردو زبان کا بہترین اخبار ہے لیکن ہر چیز کی مقابلے کیلئے مخالفت ضروری ہے کیونسٹ دشمن نوجوان ادیبوں کی بھی ایک جماعت تھی جو ہمیں ناپسند کرتی تھی اور تجربہ پرستوں کا ایک گروہ تھا جو فن و ادب کو کسی بھی نظریہ سے آلودہ کرنے کے خلاف تھے انکی اپنی تنظیم تھی جس کا مرکز لاہور میں تھا سجاد ظہیر کا گھر سینڈرسٹ بھون، ہماری ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا وہاں ترقی پسند ادیبوں کے ہفتہ وار جلسے ہوتے نئی نظمیں نئی کہانیاں اور مضامین پڑھے جاتے ان پر بحث و مباحثہ ہوتا تنقید ہوتی جس کا خلاصہ اردو رسالوں میں چھپتا اس سے اردو کی تخلیقی تحریر پر بہت گہرا اثر پڑا

کچھ عجیب اتفاق تھا کہ ان دنوں اردو کے بہت سے صف اول کے ادیب بمبئی اور پونا میں آگئے تھے، کرشن چندر خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، مجاز، مہندر ناتھ، مجروح سلطان پوری ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، سبط حسن، جوش ملیح آبادی ساغر نظامی اور دوسرے لوگ۔ یہ سب تو ترقی پسند تھے اور جو لوگ ہم سے اختلاف بھی رکھتے تھے جیسے میراجی اور اختر الایمان وہ بھی ہمارے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، پطرس بخاری اور جگر مرادآبادی جیسے ادبی عمائدین جب بمبئی آتے تو کوشش کرکے ہمارے جلسوں اور مباحثوں میں شریک ہوتے اس وقت ہندوستانی اسٹیج پر انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن چھایا ہوا تھا اور ادبی دنیا میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا دور دورہ تھا بنے بھائی انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری تھے اور سلطانہ ان کی پی اے تھیں

ہم دن میں پارٹی آفس میں کام کرتے تھے بنے بھائی قومی جنگ کے ایڈیٹر تھے اور شام کو فن و ادب پر تبادلۂ خیالات کرتے ہم مارکسزم کی روشنی میں کلاسیکی اساتذہ کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کرتے اور اس طرح کے سوالات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ غالب اور میر تقی اور کبیر کیسے ہیں آج بھی حلاوت فکر عطا کرتے ہیں ادب کی دائمی قدریں کیا ہیں ہم رمبو ملارمے اور بودلیئر کی فن کارانہ خوبیوں پر طویل مباحثے کرتے۔ یہ شاعر فرانسیسی زوال پسند ادب کی حیثیت سے مشہور تھے۔ بنے بھائی نے اصل فرانسیسی میں ان کا مطالعہ کیا تھا۔ ہماری بحثوں میں کانگا کا نام اکثر آجاتا تھا

مصوری کے بارے میں بنے بھائی مجھ سے بہتر علم اور سمجھ رکھتے تھے انھیں سیزان اگوگان

اور پکاسو کی تخلیقات پسند تھیں اور مدلیج! ملارمے اور بودلیئر کو وہ ناپسند کرتے تھے ۔ فرانسیسی زوال پسندوں کی مذمت کرتے ہوئے انھوں نے ایک مقالہ لکھا ۔ شعر محض۔ لیکن اس میں کوئی عجیب بات نہیں ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے لئے اپنی ایک انفرادی اور تخلیقاتی دنیا رکھ کر بعد اپنی زندگی کے آخری دنوں بنّے بھائی کے رویہ میں تبدیلی آگئی تھی اور انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ "شعر محض" کو اپنے مضامین کے مجموعہ میں شامل نہیں کرنا چاہتے

مجھ میں اور بنّے بھائی میں اقبال شناسی پر ہمیشہ دوستانہ جھڑپیں ہوا کرتی تھیں ۔ اقبال کی شاعری نے مجھ پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا انھوں نے فیض اور مخدوم جیسے انقلابیوں کو بھی متاثر کیا تھا باوجود اس کے کہ ان میں مسلم قدامت پرستی کی ایک رو تھی وہ اُن عظیم شاعر تھے جنھوں نے ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب کا خیر مقدم کیا تھا ۔ البتہ میرے بنّے بھائی اس تضاد کو ماننے کیلئے تیار تھے جو لینن نے ٹالسٹائی میں اور گورکی نے بیلنکن میں دیکھا تھا ۔ لیکن یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بعد کو انھوں نے اقبال کے بارے میں اپنی رائے بدل دی تھی بنّے بھائی سے میری آخری ملاقات اس سال مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں ہوئی تھی جب انھوں نے نئی یونیورسٹی میں اقبال سیمینار کا افتتاح کیا اور میں نے اقبال پر ایک مقالہ پڑھا ۔ یہ سیمینار اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کی تیاری کے سلسلہ میں ہو رہا تھا جو ہندوستان اور پاکستان ۔ اور سوویت یونین نے ۱۹۷۷ء میں منایا تھا

ملک کی تقسیم کے بعد بنّے بھائی ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے تاکہ وہاں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کریں شروع میں وہ روپوش رہے اور پھر چند سال بعد انھیں فیض اور پاکستانی فوج کے چند افسروں کے ساتھ راولپنڈی سازش کیس میں ملوث کر لیا گیا ۔ سزا کے بعد انھیں بلوچستان کی ایک جیل میں رکھا گیا ۔ انھوں نے پاکستان کی جیلوں میں پانچ سال کاٹے سرکاری وکیل نے اُن کیلئے سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا ۔ لیکن اس سے ڈرنے کے بجائے فیض نے جیل میں اپنی بہترین نظمیں اور غزلیں کہیں اور سجاد ظہیر نے اپنے ادبی تاثرات اور یادوں کی کتاب "روشنائی" لکھی اور ایران کے عظیم غزل گو شاعر حافظ پر ایک کتاب لکھی ۔ اُن کٹھن دنوں میں اپنے گھر سے ، بیوی بچوں سے دور انھیں صرف اُن کے عقائد کی پختگی نے ہمت و حوصلہ عطا کیا

رضیہ آپا لکھنؤ میں اپنی پیاری بیٹیوں کی پرورش کرنے کی جد و جہد کیلئے کرتی رہیں ۔ انھوں نے اُن کٹھن دنوں میں بے مثال ہمت کا ثبوت دیا ۔ جب بنّے بھائی پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں جیل گئے تو رضیہ آپا نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیکر اردو ادب میں ایم اے کیا اور جب بنّے بھائی پاکستان کی جیلوں میں موت کے سائے تلے قید رہے اعلیٰ درجہ کی افسانہ نگار بن گئیں

سجاد ظہیر اور فیض پاکستان میں قید ہی تھے جب مجھے دسمبر ۱۹۵۴ء میں ماسکو میں سوویت ادیبوں کی دوسری کانگریس میں شرکت کرنے کا موقع ملا جب میں نے ایوان چہل ستون میں تقریر کی اور ہندوستانی ادیبوں کی طرف سے تحفے کے طور پر فیض کی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ اور سجاد ظہیر کا نام پیش کیا تو کانگریس کے تمام شرکت کنندگان نے کھڑے ہو کر دیر تک تالیاں بجائیں یہ ہندوستانی اور پاکستانی دانشوروں کو ، جن کے رہنما سجاد ظہیر اور فیض تھے سوویت ادیبوں کا خراج عقیدت تھا ہم سب کے لئے فخر سے سر بلند کرنے کا ایک لمحہ تھا ۔ ہندوستان کی تحریک اور ساری دنیا کے دانشوروں کی مہم کے دوہرے دباؤ کے زیر اثر بنّے بھائی کو ۱۹۵۵ء میں رہا کیا گیا اور وہ ہندوستان واپس آگئے ۔ پہلے وہ لکھنؤ میں رہے اور پھر دہلی میں سکونت پذیر ہوگئے جہاں وہ کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی لیڈر کی حیثیت سے کام کرتے رہے

(انگریزی سے ترجمہ)

نیا رہبر!

ڈاکٹر سلام سندیلوی

دنیا میں درخشاں ہیں، سجاد ظہیر اب تک
اس نے رخِ اردو کو، تنویر عطا کی ہے
برگ گلِ خنداں کو، توقیر عطا کی ہے
یاد اسکی مہکتی ہے، مانند عبیر اب تک

اس رند نے محفل کا، انداز طرب بدلا
اک جذبۂ نو لے کر، وہ دہر میں آیا تھا
افکار کے جھونکوں سے، دنیا کو جگایا تھا
اس نے نگہِ نو سے، معیار ادب بدلا

کھایت میں تفکر کی، بنیاد نئی ڈالی
بکھرائی شفق ہر سو، رنگینیٔ پرچم سے
صد رنگ ضیا پھوٹی، آئینہ شبنم سے
ہر کنج گلستاں میں پھیلی نئی اجیالی

وہ اک نیا رہبر تھا ارباب سیاست کا
دنیا کو دیا اس نے، اک طرز جداگانہ
محفل کو دیا اس نے، احساس کا پیمانہ
بدلا نئی قدروں سے، انداز جماعت کا

آزادی کی خاطر وہ، اغیار سے ٹکرایا
زنداں میں گذارے دن، گھبرایا نہ ظلمت سے
ہنس ہنس کے ستم جھیلے، اکتایا نہ غربت سے
وہ تیشۂ نو لے کر، کہسار سے ٹکرایا

دو ملکوں کے رشتوں کو، مضبوط کیا اس نے
بھارت کی مئے الفت، دی روس کے ساغر کو
دی روس کی شادابی، بھارت کے صنوبر کو
دو سرخ گلابوں کو، مربوط کیا اُس نے

وہ خوشبو ہی خوشبو تھا صبا لے گئی اُس کو

(ساغر نظامی)

کیا حادثہ گذرا ہے خدارا یہ نہ پُوچھو　　جو خوشبو ہی خوشبو تھا صبا لے گئی اُس کو
چڑیوں کی چہک جس سے چمن گونج رہا تھا　　سُورج کی کرن آکے اُٹھا لے گئی اُس کو
دیکھو تو کوئی اُس گلِ رعنا کی نزاکت　　اک ہنس کے پنکھوں پہ صبا لے گئی اُس کو
اِس خواب کی وادی میں اسے کون جگاتا　　خود بادِ ابد آکے جگا لے گئی اُس کو
ہو دوسری دنیا میں بھی اک نغمۂ سرجوش　　یہ آرزوئے جشنِ نوا لے گئی اُس کو
شاید کسی سیارے میں مِل جائے محبّت　　یہ جستجوئے جنسِ وفا لے گئی اُس کو
کشتی مری گویا فقط اک شندرہ خس تھی　　اک موج اُٹھی اور بہا لے گئی اُس کو
خوشبو کی یہ اک جوئے رواں خاک پہ کب تھی　　آخر ابدیت کی صبا لے گئی اُس کو
تھی بس اس پہ بقا اور فنا دونوں ہی عاشق　　آپس کی کشاکش میں فنا لے گئی اُس کو

تعظیم کو اک گنجِ شہیدانِ وفا تھا
جب خاکِ شہیدانِ وفا لے گئی اُس کو

(از آج کل دہلی)

سجاد ظہیر

سرگزشت

میرے والد نے مجھے ۱۹۲۶ء میں انگلستان اس لئے بھیجا تھا کہ میں آئی سی ایس (انڈین سول سروس) کے امتحان میں بیٹھوں اور سرکاری افسر بنوں۔ نیز آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرسکوں اور وہاں سے بی۔اے آنرس کی ڈگری لوں، لیکن جب میں کئی سال بعد واپس انگلستان سے لوٹا تو آئی سی ایس نہیں تھا۔ انگلستان پہونچنے کے سال بھر کے اندر میں نے اپنے والد کو لکھ دیا تھا کہ آئی سی ایس بننا نہیں چاہتا۔ تب انھوں نے مجھ سے بیرسٹری پاس کرنے کیلئے کہا، کئی سال بعد پڑھ لکھ کر جب میں واپس آیا، تو بی اے (آکسن) تھا اور بیرسٹر بھی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی، یعنی کمیونسٹ اور وہ بھی محض نظریاتی طور پر اشتراکی فلسفہ حیات کو ماننے والا نہیں بلکہ اس کا پورا تہیہ کئے ہوئے کہ مجھے کل وقتی انقلابی کارکن بننا ہے۔ میرے خاندان اور اس کے ماحول کو دیکھتے ہوئے یہ بیچیدہ ہوا تھا اور جب میں میری زندگی بسر ہو رہی تھی، یہ فیصلہ انقلابی ضرور تھا اور شاید بعض لوگوں کو خیال ہو کہ یہ مشکل تھا، لیکن ایسا نہیں ہے یہ صحیح ہے کہ میرا خاندان ایک خوشحال خاندان تھا، ہم لوگ لکھنؤ میں جس مکان میں رہتے تھے، وزیر حسن روڈ پر وزیر منزل، اس میں آٹھ چار چھوٹے بڑے کمرے کشادہ دالان اور برآمدے تھے، ارد گرد ایک بڑا سا باغ، سبزہ لان، اونچے اونچے اشوک، یوکلپٹس اور مولسری کے درختوں کی قطاریں، گلاب اور دوسرے پھولوں کی کیاریاں تھیں آم کے درختوں پر پڑی اور برسات میں کوئلیں کوکتی تھیں۔

میرے والد لکھنؤ کے چوٹی کے وکیل تھے۔ بعد کو وہ اودھ چیف کورٹ کے جج ہو گئے۔ مجھ سے پہلے میرے تین بڑے بھائی اور میرے بعد میرے ایک چھوٹے بھائی، سب آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے اور وطن واپس آکر سب بڑے عہدوں پر فائز تھے گویا میرے لئے بھی خوشحالی آرام اور فراغت کی راہیں کھلی ہوئی تھیں

لیکن میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ یکبارگی نہیں بلکہ دھیرے دھیرے، رفتہ رفتہ، ہنگامہ خیز اور اچانک طریقے سے نہیں بلکہ جیسے بالکل نارمل اور فطری طریقے سے۔ آج میں اس کے متعلق سوچ سکتا ہوں اور اس تبدیلی کے اسباب ڈھونڈھ سکتا ہوں لیکن جس زمانے میں اور جس طریقے سے یہ تبدیلی ہوئی۔ اس وقت جیسے مجھے اس کا احساس نہیں ہوا خون رگوں میں تیزی کے ساتھ دوڑتا لیکن اسکی رفتار نہ دکھائی دیتی ہے نہ سنائی

زندگی کے مختلف اور متضاد پیمانے

انسان کے کردار کی تشکیل کیسے ہوتی ہے اور اس کی زندگی کا رُخ کس طرح متعین ہوتا ہے یہ بیحد پیچیدہ سوال ہے۔ جبلت اور پیدائشی خصلتیں، تعلیم و تربیت، سماجی ماحول، قومی طبقہ داری، تعلیم اور خاندانی روایات و ثقافت، شعور، تحت الشعور کا عمل اور رد عمل، ہمارے کردار ان سب کا مرکب ہوتے ہیں۔ اس بھول بھلیاں میں کیسے متعین کیا جائے کہ کسی شخص نے زندگی کی ایک خاص راہ کیوں اختیار کی، دوسری کیوں نہیں۔ بہر حال اس قسم کا تجزیہ اور تشریح ماہروں کا بیالوجی، نفسیات، سماجیات اور تعلیم کے ماہروں کا کام ہے عام طور پر ہم انسانوں کو ان کے کردار، افعال، اور اعمال اور ان کے نتائج سے جانچتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح سے جانچتے ہیں۔ خود جانچنے

دوسروں کے پہلوؤں، زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر اور نصب العین کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ بدلتے بھی رہتے ہیں۔ نیز یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک واحد تاریخی عہد یا دور میں سماج کے مختلف طبقوں یا گروہوں کے بالکل مختلف بلکہ متضاد پیمانے یا نصب العین ہوں۔ مثال کے طور پر ہم اردو اور فارسی ادب پر ہی نظر ڈالیں تو ہمیں صدیوں سے یعنی تقریباً آٹھ نو سو سال سے یہ بات نظر آتی ہے کہ احمق جاہل اور جابر حکمراں۔ بے ایمان قاضی، محتسب اور شحنہ (کوتوال) ناسمجھ بے لوچ ناصح، کورمغز عالم اور مدرس، ریاکار عابد اور زاہد کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ اور ان کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس پورے گروہ کے نافذ کئے ہوئے قوانین اور ان کے عائد کئے ہوئے اخلاقی اصولوں کو برتنے کی نہیں بلکہ توڑنے کی ترغیب دی گئی ہے، شریعت کی جگہ طریقت، ظاہری علم کی جگہ اندرونی اور باطنی علم، ظاہرداری کی جگہ اصلی سچائی اور بنیادی حقیقت تک پہنچنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ قیصر روم کی مذمت کی گئی تو رومی قانون کے مطابق سولی پر چڑھائے جانے والے عیسیٰ بن مریم کی حسین ابن علی نے خلیفۂ وقت یزید ابن معاویہ کی بیعت کرنے سے انکار کیا اور وہ "جرم" کی سزا میں قتل کر دیئے گئے۔ لیکن مسلمان اب بھی شہید کربلا کا سوگ مناتے ہیں۔ منصور حلاج انا الحق کا نعرہ بلند کرنے کی پاداش میں قتل کر دیا گیا لیکن ہمارے شاعروں کی نظر میں وہی، آج تک سچائی کے لئے جان دینے والوں کی سب سے درخشاں نشانی ہے

زندگی کے یہ متضاد اور متخالف پیمانے کیوں اور کیسے بنتے ہیں اور ہم اپنے لئے ان پیمانوں کو کیوں اور کیسے چنتے ہیں، کیوں ہم ایک خاص راستہ چلتے ہیں اور دوسرا نہیں، سماجی اور انفرادی عمل کے محرکات کیا ہیں اور کیا انسانی تاریخ کی رفتار کا بھی کوئی قانون ہے یا یہ محض اتفاقیہ حادثات کا مجموعہ ہے یا پھر کوئی انجانی غیبی، الوہی یا شیطانی قوت پردے کے پیچھے تمام تاروں کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹے کٹھ پتلیوں کی طرح سے نچاتی رہتی ہے

سیاسی حالات میں گہری اور وسیع تبدیلیاں

ایک بات صاف اور ظاہر ہے۔ ہر سمجھدار اور حساس انسان کے سامنے، شاہراہ حیات پر گذرتے وقت بار بار اور مسلسل ایسے مواقع آتے رہتے ہیں جب اسے فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ مختلف اور نوبہ نو مسائل کے پیش آنے پر وہ کون سا راستہ اختیار کرے، کس پیمانے سے اپنے یا دوسروں کے افعال و اعمال کو جانچے اور خود اپنے لئے آگے بڑھنے کا کون سا راستہ اختیار کرے اکثر یہ راستے واضح نہیں ہوتے یا خود ہم اپنے احول، عادات، یا تعصبات اور جبلتوں کے زیر اثر جیسے آنکھ بند کئے اور غیر شعوری طور پر زندگی کا سامنا سفر طے کر لیتے ہیں اور ہم کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے سامنے ایسے مواقع بھی آئے تھے اور جب ہم شعوری طور پر اپنا راستہ خود چن سکتے تھے لیکن ہم نے اسے اختیار نہیں کیا

میں جب اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ میری سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس عمر میں جب میرا شعور تھوڑا تھوڑا بیدار ہونا شروع ہوا تھا۔ جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور میری عمر پندرہ سولہ سال کی تھی تب ہمارے ملک میں آزادی کی ایک بڑی لہر اٹھی، نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک اور حب وطن کی اس لہر نے مقناطیس کی طرح مجھے اپنی جانب کھینچ لیا

دوسری جنگ عظیم شروع ہو جانے کے بعد ہمارے ملک کے سیاسی حالات میں بھی گہری اور وسیع تبدیلیاں ہوئیں

جس وقت جنگ شروع ہوئی تب ہندوستان کے تیرہ صوبوں میں سے سات میں کانگریس کی وزارتیں قائم تھیں اور خود کانگریس کے اندر دائیں اور بائیں بازو کا تصادم بہت سخت تھا۔ سبھاش چندر بوس دائیں اور ترقی پسند عناصر کی حمایت حاصل کر کے کانگریس کے صدر چن لئے گئے تھے لیکن بعد کو گاندھی جی کی حمایت حاصل کر کے دائیں بازو والوں نے انہیں اس عہدے سے استعفا دینے پر مجبور کر دیا۔ بائیں بازو والوں اور کمیونسٹوں کا یہ کہنا تھا کہ وزارتوں کی کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے انہیں برطانوی سامراج کے خلاف براہ راست جدوجہد شروع کر دینی چاہئے۔ جنگ چھڑنے کے بعد یہ مطالبہ اور بھی زور پکڑ گیا دائیں بازو کے کانگریسی لیڈر، انگریزوں سے بات چیت کرنے کے حق میں تھے لیکن انگریزوں کا رویہ پہلے کے مقابلہ میں زیادہ سخت ہو گیا تھا، ان کا کہنا تھا کہ ہندوستانی بے چوں چرا جنگ میں انکی مدد کریں جب جنگ میں انکی فتح ہو جائے گی تب ہندوستان کو ڈومنین کا درجہ دیا جائے گا اور اس میں بھی بہت

سی خبر اطمینان ہیں۔ ان حالات میں کانگریس نے صوبائی وزارتوں سے استعفا دے دیا اور مارچ ۱۹۴۰ء تک ایسا لگنے لگا کہ اب برطانوی حکومت اور ہندوستانی آزادی خواہوں سے ٹکر ہونے ہی والی ہے۔ اس وقت کمیونسٹوں کی ایک بڑی تعداد بھی کانگریس کے اندر کام کرتی تھی۔ کانگریس ایک طرح سے متحدہ قومی محاذ بنتی جا رہی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ میں بیک وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر، یوپی کی صوبائی کانگریس کی اگزیکیٹیو کا ممبر، الہ آباد شہر کانگریس کمیٹی کا سکریٹری، کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی مرکزی اگزیکیٹیو کمیٹی کا ممبر اور یوپی کی چھوٹی سی غیر قانونی کمیونسٹ پارٹی کا صوبائی سکریٹری تھا۔ مختلف ٹریڈ یونینوں، کسان سبھاؤں اور ترقی پسند مصنفین کی ذمہ داریاں اس کے علاوہ تھیں

برطانوی سرکار کا کمیونسٹوں پر حملہ

بہرحال انگریزی سرکار نے سب سے پہلا ہم کمیونسٹوں پر کیا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں جب لکھنؤ میں تھا اور اسی رات کو مانپی میں کانگریس کے سالانہ جلسے اجلاس میں شرکت کیلئے روانہ ہونے والا تھا، ایک کالی اسٹیشن ویگن اور ایک مسلح سپاہیوں سے بھری جیپ علی الصبح ہمارے گھر وزیر منزل میں اندر آکر رکی اور اس میں سے ایک انگریز پولیس افسر نے اندر آکر مجھے بلایا اور میری گرفتاری کا وارنٹ مجھے دکھایا۔ میری بیوی رضیہ اس وقت الہ آباد میں تھیں اس گھر میں صرف میری والدہ تھیں۔ وہ کافی پریشان ہوئیں اور اس انگریز پولیس افسر کو باہر آکر بھلا برا کہنے لگیں اور اس سے پوچھنے لگیں کہ میری طرح کے نیک اور اچھے آدمی کو آخر کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے؟ انگریز افسر کافی مہذب تھا، اس نے میری والدہ کی نزدیک نہیں کی بلکہ اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور اوپر کا حکم تھا اور اسے اس کے مطابق عمل کرنا تھا۔ میں اس بحث میں شریک نہیں ہوا جلدی جلدی اپنا بستر اور ضروری سامان پیک کرنے لگا اور تھوڑی دیر میں جیل جانے کیلئے تیار ہو گیا۔ چلتے وقت میری ماں نے میرے ہاتھ میں ایک سرخ گلاب کا پھول دے دیا۔ جب میں ان کو آداب کرکے اور گلے مل کر رخصت ہونے لگا تب مجھے اس کی خوشی ہوئی کہ میری والدہ رو دھو نہیں رہی تھیں وہ خاموش تھیں اور ان کی صورت سے صبر ٹپک رہا تھا — !

اس وقت لکھنؤ میں دو جیل تھے ایک سنٹرل اور ایک ڈسٹرکٹ۔ دونوں ملحق تھے اور مجھے سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ میں اس واردات کے دو بار پہلے بھی تھوڑی تھوڑی مدت کیلئے جیل کی ہوا کھا چکا تھا تیسری بار جیل میں داخل ہوتے وقت پریشانی گھبراہٹ ایک طرح کی سنسنی اور دل گرفتگی کا احساس ضرور تھا لیکن گرفتاری اور قید کو ایک ناخوش گواری سمجھ کر اس مصیبت کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی تھا خیال بار بار رضیہ کی طرف جاتا تھا، آخر ہماری شادی کو ہوئے ابھی تقریباً ایک ہی سال تو ہوا تھا اور ہم بمشکل ایک دوسرے کو پہچان پائے تھے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ دوسرے کمیونسٹ جیل میں آتے گئے، ایک دن کامریڈ اجے کمار گھوش تشریف لائے اور ان کو میرے پاس کے سیل میں رکھا گیا۔ مجھے ان کی گرفتاری پر تعجب ہوا اس لئے کہ ان کے بارے میں مجھے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ وہ انڈر گراؤنڈ ہو چکے ہیں۔ میں اس وقت کمیونسٹ پارٹی نے اپنے کارکنوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ انڈر گراؤنڈ ہو جائیں اور پھر وہ تو ہماری پارٹی کے بڑے لیڈروں میں تھے پھر کیسے انھوں نے خود کو گرفتار ہونے دیا .... وہ ہماری پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے پولٹیکل بیورو کے ممبران میں سے تھے اور پارٹی کے ہفتہ وار نیشنل فرنٹ کے پی سی جوشی اور بی ٹی رندلیوے کے ساتھ ایڈیٹر تھے ان میں جو چیز سب سے زیادہ پسند تھی وہ ان کے ذہن اور دماغ کی صفائی اور سادگی تھی۔ ان کی باتوں اور دلیلوں میں کبھی الجھاؤ نہیں ہوتا تھا۔ جنگ کے پہلے دو برس میں جب ہماری پارٹی نے بائیں بازو کی کجروی کی اصلاح کرکے قومی متحدہ محاذ بنانے کی پالیسی پر عمل کرنے کا راستہ اختیار کیا تب پی سی جوشی کے ساتھ انھوں نے پارٹی کے دائرہ اثر کو کانگریس اور دوسرے قوم پرست عناصر میں پھیلانے اور بڑھانے میں رہنمایانہ رول ادا کیا ہم دونوں جیل میں جنگ کے حالات پر تبصرہ کرتے باہر سے اپنی پارٹی کے کاموں کی اطلاع حاصل کرنے کی مسلسل کوشش کرتے۔ لیکن کسی کو یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ہم ہر وقت سیاست کی ہی باتیں کرتے تھے اجے بہت شگفتہ آدمی تھے وہ کانپور کے بنگالی تھے اور عام طور سے بڑی صاف اور شستہ اردو بولتے تھے۔ سب سے زیادہ مزہ اس وقت آتا تھا جب وہ اپنی

گفتگو میں ہماری مروجہ پاکیزہ زبان بولتے اور عوامی محاورے اور گالیاں استعمال کرتے تھے ان کے جیل میں آنے سے وہاں کی خشک اور تکلیف دہ زندگی میں جیسے جان پڑ گئی تھی لیکن افسوس کہ مہینے دو مہینے کی قلیل مدت کے بعد ہی اجے کا لکھنؤ سے دہلی کیمپ کو تبادلہ ہو گیا !

جیل میں جسمانی صحت سے زیادہ ذہنی اور روحانی صحت کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں پر انسان اپنی معمولی زندگی کے تمام کاموں کو چھوڑ دینے پر مجبور رہتا ہے، عزیزوں رشتہ داروں، دوستوں سے وہ مل نہیں سکتا۔ ان سے اگر تعلق ہوتا تو کبھی خطوط کے ذریعہ سے یا ان ہمدمے ایک دو سے جیل کے پھاٹک کے کمرے میں جیلر کی موجودگی میں ہفتے میں ایک دن گھنٹہ بھر کے لئے مل سکتا ہے۔ اخبار سے دنیا کی خبر معلوم ہو جاتی ہے۔ کتابوں کے مطالعہ سے وہ اپنے علم اور معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے۔ گو کہ ضرورت کی کتابیں ملنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر بھی کوشش کرنے سے کم از کم مجھے کافی کتابیں مل جاتی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے سب سے زیادہ تکلیف عزیزوں خاص طور سے اپنی شریک حیات سے مفارقت کی تھی اور دوسری سب سے بڑی ذہنی اذیت اور کوفت اس بات کی تھی کہ ہم نے اپنی زندگی جس کام کیلئے وقف کی تھی اور جس میں ہم برسوں سے لگے ہوئے تھے یعنی وطن کی آزادی اور اپنے مملکت کے محنت کش عوام کو منظم، متحد کر کے اور ان میں انقلابی شعور پیدا کر کے عملی جد و جہد اور انقلاب کے راستے پر آگے بڑھانے کا کام یہ سب ہم چھوڑ دینے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ جب ہمارے سامراجی دشمن ہمیں گرفتار کر کے جیل میں پھینک دیتے تھے تو وہ کبھی یہی توقع کرتے ہوں گے کہ جیل کی سزا ہمارے جسموں کو کمزور اور ہماری روحوں کو مجروح کر کے ہم میں آزادی اور انقلاب کے حوصلے اور ولولے کو کمزور کر دے گی اور پھر زخم خوردہ اور مایوس ہو کر ہم میدان جنگ سے ہٹ جائیں گے۔

چنانچہ جیل کے پھاٹک میں قدم رکھنے کے بعد سب سے پہلا خیال جو دل و دماغ میں گردش کرتا تھا وہ یہی تھا کہ دشمن کے اس حملہ کا کیسے مقابلہ کیا جائے کیسے خود کو ایسی حالت میں رکھا جائے کہ اگر ایک طرف جسمانی صحت تمام اذیتوں اور محرومیوں کے باوجود برقرار رہے تو دوسری طرف دماغ میں اپنے نصب العین پر یقین اور اعتماد اور دل میں سامراجی اور رجعتی قوتوں سے تادم حیات لڑنے اور ان کو شکست دینے کا حوصلہ اور ولولہ باقی رہے میں سوچتا تھا کہ اگر میں اپنی اس سعی میں کامیاب ہوا تو در اصل اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود، اور اس کے باوجود کہ میرے ہاتھ میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہیں اور مجھے، اپنے وسیلے و ایلیف وطن کے سرسبز کھیتوں، اس کے ندم اور رو پہلے دریاؤں، اس کے گھنے جنگلوں، اسکی گنجان بستیوں اور ان میں سے بلند ہونے والی مردوں عورتوں اور بچوں کی صداؤں سے محروم کر دیا گیا ہے، اور میں آزادانہ اپنے دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں گھوم پھر نہیں سکتا پھر بھی یہ سب قید کی تنہائی میں میرے دل کے پردے پر چلتی پھرتی اور بولتی تصویروں کی طرح ہر گھڑی اور ہر دم موجود تھیں اور مجھے زندہ اور صحیح سلامت رکھنے میں میری سب سے بڑی مددگار تھیں اور ایسا ہونا یہ ثابت کر دے گا کہ حق کے لئے لڑنے والوں کی پابندی ان کی نہیں بلکہ ان جابروں کی شکست ہے جنھوں نے مجھے اور میری طرح کے ہزاروں لاکھوں دوسرے آزادی خواہوں کو اپنے ظلم و تندی کا نشانہ بنایا ہے مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی (بالشویک پارٹی) کی تاریخ کی چند کاپیاں بڑی مشکل سے ہندوستان میں غیر قانونی طریقے سے پہونچ گئی تھیں، ان کو جیل کے باہر بھی دستیاب کرنا مشکل تھا۔ لیکن لکھنؤ کے کمیونسٹ ساتھیوں نے جو خود انڈر گراونڈ تھے اور جن کے ساتھ میں نے تعلق قائم کر لیا تھا۔ یہ کتاب میرے اور میرے ساتھیوں کے مطالعہ کے لئے باہر سے ہمیں بھجوا دی؛ چونکہ یہ تین چار سو صفحوں کی کتاب تھی اس لئے اس کی جلد توڑ کر اس کے باب الگ کر لئے گئے اور پھر رفتہ رفتہ انھیں میرے پاس پہونچا دیا گیا، دو تین مہینے اسکی باقاعدہ اسٹڈی کے بعد یہ کتاب جیسے آئی تھی، اسی طرح پارہ پارہ کر کے باہر واپس چلی گئی تاکہ دوسرے جیلوں میں اسکو پہونچایا جا سکے۔

ہمارے بہت سے نوجوان، اور میں اس زمانے میں کم و بیش اسی زمرے میں شامل تھے جو آزادی وطن کی انقلابی تحریک میں شریک ہوتے تھے۔ زندگی کی بیشمار معمولی اور نارمل مسرتوں کو ترک کرنے پر مجبور تھے۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تو معاشی مسئلہ

تھا یعنی کل وقتی انقلابی کارکن بننے کے یہ معنی تھے کہ ہم کو اپنی نارمل زندگی بسر کرنے کے لئے نوکری کر کے یا کوئی پیشہ اختیار کر کے جو آمدنی کا وسیلہ نکالنا تھا، اس سے درگزر کریں۔ تو پھر گھر مکان، کپڑے اور شادی یا عشق کرنے کیلئے گرہ میں مال چاہیئے وہ کہاں سے آئے گا؟ ہماری پارٹی کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ اپنے کل وقتی کارکنوں کو معقول رقم دے سکے۔ بمشکل ہم لوگ اس زمانہ میں اپنے ورکروں کو بیس تیس روپے ماہوار دے سکتے تھے، اور چونکہ یہ بھی ہمدردوں کے چندے پر منحصر تھا، جو کبھی جمع ہوتا تھا کبھی نہیں اس لئے اس کا بھی یقین نہ ہوتا کہ یہ رقم باقاعدگی سے ملیگی، مجبوراً ہم کو مختلف ذریعوں سے اپنی بسر اوقات کے لئے کہیں نہ کہیں سے، اپنے رشتہ داروں، عزیزوں، ہمدردوں اور خوشحال دوستوں سے مالی امداد لینا پڑتی تھی جو کبھی ملی نہ ملی تو پھر محرومیاں ایک طرف اور بے یقینی دوسری طرف لگا تھا۔ عزم اور حوصلے کے باوجود اپنا نفسیاتی اثر ہم پر ڈالتی ہی تھیں اور ہم نارمل انسانوں سے کسی قدر مختلف ہو جاتے تھے انقلاب لانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کیلئے ہم تیار تھے اور روزمرہ ہماری زندگی میں قربانیوں کا ہی سامنا رہتا تھا۔ لیکن قربانیاں ہمارے کردار پر اپنا اثر ضرور ڈالتی تھیں جسکی وجہ سے کوئی کچھ عجیب حرکت کرتا کوئی کچھ آخر انقلاب کا شعلہ کہاں تک اپنی گرمی اور روشنی پہونچاتا، پھانسی کے تختہ پر انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر چڑھ جانا ایک زبردست جذبے کے تحت نسبتاً سہل ہے لیکن معمولی طور پر زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھتے ہوئے انقلابی عمل اور جدوجہد میں سنجیدگی سے، اور حوصلہ مندی سے مہینوں اور برسوں گذارتے رہنا جھنجھلانے سے کم نہیں اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کئی اشخاص جو ایک خاص وقت بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہماری تحریک میں داخل ہوتے ہیں بعد کو پریشان ہو کر اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور علیحدہ ہونے کے بعد ان کو اپنے میں نہیں بلکہ ہماری انقلابی تحریک میں طرح طرح کی خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن ہماری تحریک تو انسانوں ہی کی طرح انسانوں کے اجتماع اور اجتماعی عمل کا دوسرا نام ہے ظاہر ہے کہ اس میں انسانی خامیاں ہیں اور اس نے تکمیل کا دعویٰ کبھی نہیں کیا لیکن عوامی انقلاب کو قریب تر لانے اور کامیاب بنانے کے لئے اس تنظیم اور اس اجتماعی عمل کے علاوہ اور دوسرا راستہ کون سا ہے "

وامق جونپوری

چراغِ میکدہ

ہمارے میکدہ کا بجھ گیا اک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ
وہ ایک غم تھا جو سیلاب بن کے امڈا تھا
اور ایک غم یہ ہے جو آگ بن کے پھیل گیا
یہ الزام یہ ہیں بنائیں جگر ہے صد پارہ
ہمیں تسلیاں مت دو کہ ہم ہیں اہلِ وفا
ہے آج قابو کے اندر ہمارا دل نہ دماغ
ہمارے میکدہ کا بجھ گیا اک اور چراغ
ستارے ٹوٹ رہے ہیں فلک پہ برسوں سے
نظارے ان گنت اوجھل ہوئے ہیں نظروں سے
منارے روز گرا کرتے ہیں بلاؤں سے
کنارے ہوتے ہی رہتے ہیں زیرِ موجوں سے
مگر یہ غم وہ ہے جس سے کبھی نہ ہوگا فراغ
ہمارے میکدہ کا بجھ گیا اک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ

ہم آج انکی زیارت سے ہو گئے محروم
پلک جھپکتے ہی شکلیں جو ہو گئیں معدوم
نتیجہ کچھ نہیں اس سوگ کا ہمیں معلوم
مگر بھلا نہیں سکتا انھیں دلِ مغموم
کہ شیشہ سے نہیں جاتا کبھی شکست کا داغ
ہمارے میکدہ کا بجھ گیا اک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آ رہا ہے سوئے ایاغ

وہ شمعِ فکر ہے جو تا ابد ضیا بخشے
وہ جستجو ہے جو صحرا کو راستہ بخشے
وہ روشنائی ہے لکھنے کی جو ادا بخشے
ہوں جن میں خوبیاں اتنی انھیں خدا بخشے
زبانِ حال قلم دے رہی ہے ان کا سراغ
ہمارے میکدہ کا بجھ گیا اک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آ رہا ہے سوئے ایاغ

ہماری سمت مگر کیا بڑھے گی ظلمتِ شب
کہ ہم ہیں وارثِ آتش بجان و شعلہ بہ لب
ہمارے ترکہ میں آئے ہیں بارہائے ادب!
محافظِ ادب و شعر ہے ہمارا لقب
ہمیں ہیں بلبلِ گلزار شہرِ قلب و دماغ
ہمارے میکدہ کا بجھ گیا اک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آ رہا ہے سوئے ایاغ

انھیں چراغوں کے گل سے جلیں گے کتنے چراغ
انھیں ایاغوں سے چھلکا کریں گے کتنے ایاغ
ہمارے میکدہ کا بجھ گیا اک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آ رہا ہے سوئے ایاغ

مہاکوی ٹیگور

سجاد ظہیر

خوش قسمتی سے میں ایک ایسے دور میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا جب ہماری سرزمین کو ہندوستان کی انتہائی عظیم المرتبت شخصیتوں کی قدم بوسی کا شرف حاصل تھا یہ وہ شخصیتیں تھیں جو پورے ملک کے لکھوکھا انسانوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوئیں اور جن کے زیر اثر لکھوکھا کروڑوں نے نشوونما حاصل کی میری مراد گاندھی نہرو اور رابندر ناتھ ٹیگور سے ہے میری یہ بھی خوش نصیبی ہے کہ مجھے کئی سال نہرو کے ساتھ کام کرنے اور گاندھی اور ٹیگور سے ملنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا

تیسری دہائی میں رابندر ناتھ ٹیگور کا نام ہندوستان کے سبھی پڑھے لکھے حلقوں میں اچھی طرح جانا پہچانا نام بن چکا تھا اور ادب سے دلچسپی کی وجہ سے اسکولی تعلیم کے زمانہ میں ہی ان کی کتاب "گیتانجلی" انگریزی اور ہندی میں پڑھ چکا تھا مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے جو طالب علمی کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے میں ان دنوں لکھنؤ کے کرسچین کالج میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا جب میں نے زندگی میں پہلی بار ادبی انعام لیا ہم لوگوں سے تین گھنٹے میں ایک مضمون لکھنے کو کہا تھا جس کا عنوان دیا گیا تھا "میرے خوابوں کا ہندوستان" میں نے اپنا مضمون ٹیگور کی ایک مشہور نظم پر ختم کیا تھا جو مجھے زبانی یاد تھی

قیصر باغ کا جلسہ

بعد میں یونیورسٹی پہنچنے کے بعد میں نے ٹیگور کی وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو انگریزی میں چھپ چکی تھیں ان کہانیوں میں بھوکے پتھر، اور کابلی والا، اور ان کے ناول، گورا سے میں بےحد متاثر ہوا اور اس طرح میں ٹیگور کا پرستار بن گیا اسی زمانہ میں مجھے رابندر ناتھ ٹیگور کو دیکھنے اور سننے کا پہلی بار موقع ملا، وہ اپنی یونیورسٹی "وشو بھارتی" کے لئے روپیہ جمع کرنے کی غرض سے لکھنؤ آئے تھے اس موقع پر انھوں نے دو جگہ تقریریں کیں۔ پہلی تقریر لکھنؤ یونیورسٹی میں ہوئی اور دوسری تقریر بارہ دری قیصر باغ میں تھا۔ قیصر باغ کا جلسہ اودھ کے تعلقداروں، راجاؤں اور نوابوں کی طرف سے بلایا گیا تھا جیسا انھیں یاد ہے ان تاروں نے ہندوستان کے اس عظیم شاعر کو ایک تھیلی زر پیش کیا، یہ کیسہ زر تھا صرف ۲۰ ہزار روپیہ۔ اس وقت مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجھے اور میرے نوجوان طالب علم دوستوں کو ان زمینداروں اور جاگیرداروں کی کنجوسی پر بڑا غصہ آیا تھا۔ جب کوئی وائسرائے لکھنؤ آتا تو یہی راجے مہاراجے یہی تعلقدار اور نواب، شراب و کباب کی محفلوں اور آتش بازی پر پانی کی طرح روپیہ بہا دیتے۔ لیکن ہماری مادر وطن کے عظیم ترین شاعر اور ایک عظیم ترین مقصد کیلئے انکی تجوریوں سے ۲۰ ہزار روپیہ ہی نکل سکے یقیناً مہاکوی ٹیگور لکھنؤ سے اسی طرح دل گرفتہ واپس گئے ہوں گے جس طرح وہ امریکہ سے واپس لوٹے تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ جب انھوں نے یونیورسٹی ہال میں ہندوستان کے نوجوانوں کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور جوش و خروش اپنے ساتھ محبت اور عقیدت کا والہانہ اظہار دیکھا ہوگا تو ان کے دل کو ڈھارس ملی ہوگی اور روح کا وہ بوجھ ہلکا ہو گیا ہوگا جو ان راجوں اور نوابوں کی کم ظرفی کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا

اسی واقعہ کے کئی برس بعد مجھے لندن میں رابندر ناتھ ٹیگور سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ ہماری بڑی یادگار ملاقات بھی تھی ان دنوں میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھا کرتا تھا اور ٹیگور لکچر دینے کے لئے آکسفورڈ آئے تھے اس وقت آکسفورڈ میں لگ بھگ سو ہندوستانی طالب علم تھے اور ہم میں سے اکثر لوگ ٹیگور کو سننے جایا کرتے تھے مجھے اب ٹھیک ٹھیک یاد نہیں ہے کہ ان لکچروں کا واقعی موضوع کیا تھا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان میں دنیا میں امن اور زندگی میں حسن اور محبت کیلئے تمام انسانوں سے اتحاد اور یکجہتی کی دردمندانہ اپیل ہوا کرتی تھی وہ دردمندانہ اپیل جو ٹیگور اپنی روح کی گہرائیوں میں ڈوب کر کیا کرتے تھے ان کا کالا ڈھیلا ڈھالا جبہ سفید ریشم کی طرح داڑھی کندھوں کو چھوتی ہوئی لانبی زلفیں۔ چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہیں یوں محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی فرشتہ آسمان سے اتر آیا ہے اور ہمارے جوان دنیا کی وادیوں میں اس کے سرمدی پیغام کی صدائے بازگشت گونج رہی ہے

ٹیگور آکسفورڈ مجلس میں

آکسفورڈ میں میرے کئی بنگالی دوست تھے۔ ہیرن مکرجی (جواب لوک سبھا کے ممبر ہیں) ہمایوں کبیر، ڈاکٹر جے سی گھوش ہم لوگ آکسفورڈ میں ٹیگور کی رہائش گاہ گئے اور ان سے مل کر انھیں ہندوستانی طالب علموں کی انجمن۔ آکسفورڈ مجلس کے جلسے میں آنے اور تقریر کرنے کی دعوت دی جس کو انھوں نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا یہ انکی مہربانی اور بزرگانہ شفقت ہی تھی کہ وہ ہماری چھوٹی سی بیٹھک میں شرکت کرنے پر تیار ہو گئے اس جلسہ میں ہمارے انگریز دوستوں کو ملا کر سو تک بھی نہیں تھے

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں ہم سے کچھ نوجوان انتہائی بپھرے ہوئے تھے کیونکہ اس وقت ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک چل رہی تھی اور برطانوی سرکار ہمارے قومی رہنماؤں کے علاوہ ہمارے ہزاروں ہم وطنوں کو پکڑ کر جیل میں ڈال رہی تھی اسی انقلابی ہیجان اور جوانی جوش کے عالم میں یہ کہاں ممکن تھا کہ ہم صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ٹیگور کا روحانی پیغام سنتے۔ چنانچہ جب ٹیگور نے اپنی تقریر ختم کی تو میں کھڑا ہو گیا اور کسی قدر بے صبری کے لہجے میں ان سے پوچھا کہ ایک ایسے وقت جب ہندوستان میں ہمارے عوام قومی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں اور جان و مال کی قربانیاں دے رہے ہیں آخر آپ یورپ میں گھوم کر یورپی لوگوں کو محبت اور روحانیت کا اپدیش کیوں دے رہے ہیں؟ شاید میرا یہ سوال رابندر ناتھ کے لئے بالکل غیر متوقع تھا اور یوں معلوم ہوا کہ میری یہ گستاخی انھیں کچھ ناگوار گزری میرا خیال تھا کہ ٹیگور مجھے کچھ سرزنش کریں گے لیکن شرافت بردباری اور خلق مروت کا دوسرا نام ٹیگور ہی تو تھا

چنانچہ سلیم الطبع ٹیگور نے انتہائی محبت اور شفقت کے ساتھ
جواب دیا کہ ہر شخص کو اپنے انداز میں اپنے عوام کی اپنی بساط
بھر خدمت کرنی چاہیئے اور میں اپنے انداز میں اپنے عوام
کی اپنے مقدر بھر کوشش کر رہا ہوں

پھر انھوں نے میرے دوست ہیرن مکرجی سے مخاطب ہو کر بنگالی میں پوچھا کہ کیا تمہارے اس دوست نے میری نظمیں اور گیت نہیں پڑھے۔ جب بھی تمہیں وقت ملے، انھیں میرا کلام سناؤ۔ اس چھوٹے سے واقعہ کے بعد میری نظروں میں ٹیگور کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی اور آج بھی جب میں یہ باتیں لکھ رہا ہوں تو مجھے اس گستاخی پہ ندامت اور شرمندگی محسوس ہو رہی ہے جو میں نے ۴۰ سال پہلے نادانی سے کی تھی

رابندر ناتھ ٹیگور سے میری تیسری ملاقات، کلکتہ میں ان کے مکان پر ہوئی ان دنوں میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیشن میں شرکت کے لئے کلکتہ گیا تھا۔ یہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے کا زمانہ تھا۔ گاندھی جی اور کانگریس کے دائیں بازو

کی مخالفت کے باوجود کانگریس کی صدارت پر سبھاش بابو کے چناؤ کے باعث کانگریس میں پھوٹ کے بادل منڈلا رہے تھے میں نے ایک منشر کے دوست کی مدد سے مہاکوی سے ملاقات کا وقت لے لیا اس وقت کرشنا کرپلانی ان کے سکریٹری تھے وہ مجھے اپنے ساتھ پہلی منزل پر لے گئے، رابندر ناتھ ٹیگور سخت بیماری کے بعد ابھی ابھی صحت یاب ہوئے تھے اور کافی کمزور دکھائی دے رہے تھے چہرے پر بڑھاپا ابھی زیادہ نمایاں تھا اس وقت وہ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن اس کمزوری کی حالت میں بھی مجھ کو دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کھڑے ہو گئے اور بڑی گرمجوشی سے ملے!

میں مہاکوی سے اردو ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس کے لئے ایک پیغام چاہتا تھا جو کچھ دنوں بعد الٰہ آباد میں ہونے والی تھی جواہر لال نہرو نے اس کانفرنس کا افتتاح کرنے سے اتفاق کر لیا تھا لیکن ابھی میں اپنے دل کی بات کہنے بھی نہ پایا تھا کہ انھوں نے اردو شعر و ادب کا ذکر چھیڑ دیا وہ جانتے تھے کہ میں اردو کا ادیب ہوں۔ کہنے لگے کہ میں اردو اور خاص طور پر اردو کی شاعری کو بہت پسند کرتا ہوں" میں نے انھیں بتایا کہ اردو کے بہترین ادیب بھی ان کی تخلیقات سے بیحد متاثر ہوئے ہیں اور وہ ہم سب کے مہاگرو ہیں۔ مجھے رابندر ناتھ ٹیگور سے اپنی بات چیت اچھی طرح یاد ہے انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اردو اور ہندی کے درمیان نامناسب تفاوت کو پسند نہیں کرتے انھوں نے کہا کہ بنیادی طور پر یہ دونوں زبانیں ایک ہیں اگر اردو اور ہندی کے ادیب اور لیکھک اپنے اونچے طبقہ کی تنگ نظریوں کو چھوڑ دیں اور زیادہ سے زیادہ عوام کے قریب جائیں جو بہرحال ایک ہی زبان ہندوستانی بولتے ہیں تو اردو اور ہندی کے درمیان خلیج پاٹی جا سکتی ہے انھوں نے بڑے غصیلے لہجہ میں بعض لوگوں کے تعصبات اور تنگ نظریوں کی مذمت کی اور بتایا کہ ہمارے جیسے ملک میں جہاں مختلف مذہبوں کو ماننے والے اور گوناگوں زبانیں بولنے والے لوگ رہتے بستے ہیں فراخدلی وسیع نظری اور رواداری کی کتنی ضرورت ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جواہر لال نہرو نے ان سے پوچھا تھا کہ بندے ماترم ترانے میں کیا ایسے بند ہیں جن کے بارے میں مسلمانوں کو مذہبی نقطۂ نظر سے واجبی اعتراض ہو سکتا ہے انھوں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس ترانے میں ایک ایسا بند ہے جس کو قومی اجتماعوں میں جن میں مسلمان بھی شریک ہوں گانا نہیں چاہیئے۔ مسلمانوں کو تو چھوڑ دیجئے ایک برہمو کی حیثیت سے خود مجھے بھی اس بند پر اعتراض ہوگا چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس نے اس بند کو ترک کر دیا رابندر ناتھ نے بڑے غصیلے لہجہ میں مجھے بتایا کہ کچھ متعصب لوگوں کو یہ بات بڑی ناگوار گذری اور انھوں نے ان کے ساتھ ساتھ نہرو پر بھی تنقید کیا کبھی میں نے مہاکوی ٹیگور سے کہا کہ خود ہماری ترقی پسند ادیبوں کی تحریک میں اس قسم کے رجعت پرست رجحانات ہیں جن کے خلاف ہم لگاتار جہاد کر رہے ہیں

بہرحال مہاکوی ٹیگور نے میری درخواست پر ترقی پسند ادیبوں کی الٰہ آباد کانفرنس کے لیے پیغام بھیجنے سے اتفاق کر لیا۔ آج تک رابندر ناتھ کا یہ بلند پایہ اور جلیل القدر پیغام ہمارے پاس موجود ہے جس کو ہم اپنی انتہائی قیمتی اور بیش بہا دستاویز سمجھتے ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کو ہم سے بچھڑے ہوئے ۳۰ سال سے زیادہ ہو گئے لیکن یہ ان کی عظمت اور بزرگی کی ایک دلیل ہے کہ وقت کے ساتھ حسن اور دلکشی کی وہ شمع جو ٹیگور نے جلائی تھی روشن سے روشن تر ہوتی جاتی ہے یہ شمع ان ساری چیزوں کی جگمگاتی علامت ہے جو ہندوستانی تہذیب میں اعلیٰ قدر و قیمت رکھتی ہے

علامت ہے حق اور صداقت کے لئے انکی لافانی تلاش کی
علامت ہے انسانی روح کی پاکیزگی کیلئے انکی پیہم جستجو کی
علامت ہے حیات جاودانی کے لئے انکی بے پناہ آرزو کی

●

جامِ الوداعی

فیض احمد فیضؔ

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
نہ اب دشتِ جنوں کی شامِ تمکیں
نہ گل گشتِ بہاراں کی صبحِ رنگیں
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غم ہائے وطن میں اشک باری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر
بہ نامِ شاہدِ نازک خیالاں
بیادِ مستیٔ چشمِ غزالاں
بہ نامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بہ یادِ کلفتِ ایامِ زنداں
صبا اور اس کا اندازِ تکلم
سحر اور اس کا آغازِ تبسم
خلا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحر گہ اب اسی کے نام ساقی
کرو اب ختمِ دورِ جام ساقی
بڑھاؤ شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

سید احتشام حسین مرحوم

فکر و عمل کا مخلص رہنما

آج مجھے بیس سال پہلے کی کچھ باتیں یاد آرہی ہیں سجاد ظہیر کو میں نے پہلے بنّے بھائی ہی کی حیثیت سے جانا یہ اس وقت کی بات ہے جب میری عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی تھی کیونکہ میرے دوسرے لڑکے لیکن بنّے بھائی کے بعض قریبی رشتہ داروں کے یہاں نہ صرف ان کا بلکہ ان کے دوسرے بھائیوں اور عزیزوں کا ذکر آیا دیہات کی کسی قدر بھی بھی اور سست رفتار فضا میں لکھنؤ میں رہنے والے پڑھے لکھے عزیزوں کا ذکر جو اکثر خوش گوار جھونکوں کی فرحت پیدا کرتا تھا تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد یہ ذکر صحیح غلط حقیقی معلومات کے ساتھ برابر آتا رہتا کبھی معلوم ہوتا کہ بھائیوں میں سے کوئی ولایت سے پڑھ کر واپس آیا ہے کوئی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گیا ہے کسی کو بڑی ملازمت مل گئی ہے کوئی بیرسٹری میں نام پیدا کر رہا ہے، کسی کی شادی ہوئی ہے پھر ایک بڑا وقفہ گزرا اوروں کے ساتھ بنّے بھائی کا ذکر کم ہوتا تعلیم کی وجہ سے میرا رابطہ بھی دیہات سے کم رہ گیا تھا۔ اس لئے شاید میں وہاں کے تذکروں سے بے خبر رہنے لگا تھا۔ لیکن پھر جو ان کا ذکر ہوا تو ایک دم سے نئے ہی انداز میں۔ وہی عزیز جو بنّے میاں کا ذکر محبت اور فخر سے کرتے تھے ناگواری اور نفرت سے کرنے لگے نئی تعلیم پر جا دبے جا اعتراض اٹھا کے ساتھ اپنے بچوں اور قرابت داروں کو لامذہبیت اور آزاد خیالی سے محفوظ رہنے اور شریف خاندانوں کی عزت اور غیرت برقرار رہنے کی دعائیں مانگنے لگے معلوم ہوا کہ افسانوں کا کوئی مجموعہ "انگارے" شائع ہوا ہے جس کے روحِ رواں سجاد ظہیر صاحب ہیں اور جس میں مذہب اور اخلاق کی بیخ کنی کی گئی ہے

اس وقت میں الہ آباد میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا اور اپنے بہت ہی قدامت پسند ماحول کے باوجود تحریک آزادی سے متاثر اور زندگی کے سمجھنے کا متمنی۔ میرے لئے اس خبر میں گھبراہٹ، خوف اور ایک طرح کے چھپے ہوئے فخر کے جذبات کی آمیزش تھی اس وقت تو یہ کتاب پڑھنے کو نہیں ملی لیکن یہ خیال آزادی کی جد و جہد کے پس منظر میں ذہن میں جم گیا کہ یہ یقیناً کوئی ایسی کتاب ہوگی جس سے برطانوی سامراج کے مفاد کو بھی نقصان پہونچتا ہوگا۔ پوشیدہ خوشی اس بات کی تھی کہ کتاب کا تعلق ایک ایسے شخص سے ہے جسے ہم نہ جاننے کے باوجود اپنا عزیز کہہ سکتا ہوں۔ پڑھنے کی فکر یوں تھی کہ دیکھوں افسانوں میں ایسی باتیں کس طرح لکھی جاتی ہیں جن کے ممنوع قرار دینے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور جذبہ آزادی کی امنگ نے۔ "انگارے" اور سجاد ظہیر کے لئے ذہن میں ایک جگہ پیدا کر دی ہے!

یونیورسٹی میں دو سال گذارنے اور ذہنوں کی وسیع تر دنیا میں داخل ہونے کے بعد ایسی کتابیں پڑھنے اور ایسے لوگوں سے ملنے کی خواہش شدید ہو گئی جن سے خاص طرح کے لوگ متنفر اور خوف زدہ تھے چنانچہ بہت سا وقت سیاسی جلسوں، جلوسوں، لائبریریوں اور کتب خانوں میں صرف ہونے لگا اور جنگ آزادی جب شباب پر تھی معلوم ہوا کہ جو لوگ پنڈت نہرو کے خیر خواہ ہیں وہ سب کے سب الٰہ آباد میں موجود ہیں ان میں ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر احمد، ڈاکٹر لوہیا کے نام خصوصیت سے لئے گئے اپنی کم عمری کی وجہ سے میں فوراً تو نہ مل سکا لیکن ۱۹۳۵ء میں جب ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی تو ڈاکٹر عابد حسین اور پھر سجاد ظہیر بھی سہائے فراق کے وسیلے سے ان سب سے ملنے کی راہیں کھل گئیں

زندگی کا طلسمی دَور

پہلے پہل میں نے بنے بھائی کو ان کے والد سر وزیر حسن مرحوم کے ساتھ ہائی کورٹ جاتے ہوئے دیکھا اس وقت وہ ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس تھے اور ہائیکورٹ کے ایک وکیل معلوم ہوتے تھے لیکن چند ہی دنوں کے بعد ایک ادبی جلسے میں وہ کچھ روپوش کا لگی نظر آئے اور پھر میں نے کبھی انھیں وکیل کے روپ میں نہیں دیکھا ادبی جلسوں میں اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں گھر پر ان کی لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں انگریزی فارسی اور اردو کی بڑی اہم کتابیں نظر آئیں اور باتیں کرکے اندازہ ہوا کہ ان کا مطالعہ بے حد وسیع اور ذوقِ ادب بے حد لطیف ہے انھیں ہندوستان کی اعلیٰ ادب تہذیب اور تاریخ سے گہری دلچسپی ہے اور اپنے ادب کا سرمایہ بچانے کی زبردست فکر انھیں بے چین رکھتی ہے ان دنوں کے دو ادبی جلسوں کی یاد ابھی تازہ ہے جلسے میں پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے عوامی تہواروں اور لوک گیتوں پر ایک بڑی دلچسپ تقریر کی تھی اور اپنی کتاب کویتا کومدی کے لئے گیت فراہم کرنے میں جن دشواریوں کا سامنا ہوا تھا ان کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا تھا دوسرا جلسہ وہ جس میں سجاد ظہیر نے اپنا ڈرامہ "بیمار" پڑھا تھا اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا کہ ہم زندگی کے کسی طلسمی دور میں داخل ہو رہے ہیں ایک ایسے دور میں جو سیاسی جد و جہد اور خوابِ آزادی سے ہم آہنگ ہے اور ہماری نئی دنیا میں بنے بھائی کی ذات ایک روشنی کی مینار کی سی نظر آتی تھی ۱۹۳۱ء کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا

پنڈت جواہر لال نہرو فیض پور کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے انھیں اس کا وقت نہیں ملتا تھا کہ وہ خطبۂ صدارت لکھیں۔ صرف چند دن رہ گئے تھے جب نہوں نے خطبے کی تکمیل کی، کانگریس سیشن میں چار پانچ دن باقی رہ گئے تھے قریب قریب سطروں کے ۱۲ فل سکیپ صفحات پر ٹائپ کیا ہوا خطبہ صدارت انگریزی میں چھپنے کے لئے دیدیا گیا اور یہ طے ہوا کہ دو دن کے اندر اس کا اردو اور ہندی ترجمہ بھی ہو اور چھپ کر مل بھی جائے تاکہ کوئی شخص اُسے وقت پر فیض پور پہنچا دے!

اردو کے ترجمے کے لئے ڈاکٹر اشرف مرحوم اور ہندی کے لئے ہمارے موجودہ وزیر اعظم لال بہادر شاستری کا انتخاب ہوا جو اس وقت لکھنؤ سٹی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر اشرف کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے قرعۂ فال سجاد ظہیر کے نام پڑا۔ صرف رات بھر کا وقت تھا صبح کو ترجمہ چھپنے کیلئے دینا تھا۔ بنے بھائی کو کسی طرح خیال ہوا کہ مجھے مدد کے لئے ساتھ لیں چنانچہ وہ یونیورسٹی آئے مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی تو یہ پیغام چھوڑ کر چلے گئے کہ میں جلد سے جلد ان کے گھر پہنچ جاؤں، چنانچہ میں شام کو جب ان کے یہاں پہونچا تو صورتِ حال کا علم ہوا اور یہ طے ہوا کہ رات بھر میں ترجمہ کر لیا جائے۔ بنے بھائی میں اور نور الحسن (صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) جو اس وقت کالج کے طالب علم تھے تقسیم کرکے ترجمہ کرنے لگے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے جب صبح کا دھندلکا چھا رہا تھا اس وقت ہم نے ترجمے کی آخری سطریں پوری کر لیں اس سلسلے کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ شاستری تقریباً ہمارے دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے اور چونکہ وہ اردو سے بھی اچھی طرح واقف تھے اس لئے ہمارے ترجمے کے اوراق سامنے رکھ کر ہندی میں لکھتے جاتے تھے مجھے یہ بھی یاد ہے کہ چند دنوں کے بعد بنے بھائی نے بتایا کہ پنڈت نہرو کو ہم لوگوں کا ترجمہ بہت پسند آیا۔

ان دنوں بنے بھائی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے سلسلے میں دو بار الٰہ آباد سے باہر کے سفر کئے لکھنؤ میں پہلی کانفرنس کی جس میں مرحوم پریم چند نے صدارت کی تھی، میں امتحان کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکا کچھ ہی دن بعد ۱۹۳۷ء میں شمالی ہند کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس الٰہ آباد میں ہوئی جس میں پنڈت نہرو آچاریہ نریندر دیو، جوش ملیح آبادی، ترالاجی، بے پرکاش نرائن اور ادب کے اہم رہنماؤں نے شرکت کی۔ یہ سب کچھ وہ ایسی فکر اور ایسی تنظیمیں اچھا کر سکتے تھے کہ ہم حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔

میں طبعاً کم آمیز ہوں اس لئے میں ایسے مواقع اکثر کھو دیتا تھا جب ان کے توسط سے ہندی، اردو، انگریزی، بنگلہ اور دوسری زبان کے ادیبوں سے ملنے میں آسانیاں پیدا ہوتی تھیں یہاں تک کہ بنے بھائی آہستہ آہستہ اس جدید ادبی تحریک میں ایک مرکزی جگہ کے مالک ہو گئے اور وہ تمام نئے لکھنے والے جنھیں تھوڑا بہت بھی ادب اور زندگی کے تعلق کا شعور تھا ان کے قریب آتے گئے ان تمام باتوں کی تفصیلی روداد انکی تصنیف روشنائی میں بڑے دلکش انداز میں بیان کی گئی ہے انھیں دہرانا مقصود نہیں ہے صرف یہ کہنا ہے کہ انکی ادبی صلاحیتیں ان کا سنجیدگی سے سوچ سمجھ کر مسائل پہ اظہار خیال کرنے کا انداز۔ ان کا دلکش اسلوب نگارش ان کا ادب اور سیاست کے رشتہ پر زور دینے کے باوجود ادبی نقطۂ نظر پہ ٹکی باتیں ایسی تھیں جن سے ان کے وسیع مطالعہ اور بیدار ذہن کا پتہ چلتا ہے جس سے ہم سب کا متاثر ہونا فطری تھا

۱۹۳۸ء میں لکھنؤ پہونچ گیا۔ بنے بھائی کبھی کبھی وہاں آتے اور وہاں کی ادبی محفلوں میں جان ڈال دیتے تھے ان دنوں وہاں سبھی تھے۔ ڈاکٹر علیم، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر، مجاز، سردار جعفری، سبط حسن، حیات اللہ، سلمان احمد اس سے لکھنؤ کی ادبی گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد بنے بھائی کی شادی ہوئی اور زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور ہم نے سنا کہ بنے بھائی اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے جیل بھیج دیئے گئے جس کی یادگار ان کے خطوط ''نقوش زنداں'' اور وہ چند مضامین ہیں جو انھوں نے ''ادب کے لئے'' جیل میں سے لکھے

اس کے بعد سے کبھی ایسا نہ ہوا کہ وہ کہیں جم کر ایک جگہ رہتے اور وہ جہاں رہے کبھی۔ میں ہمیشہ ان جگہوں سے دور رہا کبھی بھولی بھٹکی ملاقاتیں کبھی بھولے بھٹکے خط یہی رشتہ رہ گیا لیکن اس زمانے کے علاوہ جب وہ پاکستان میں تھے کوئی وقت ایسا نہیں گذرا کہ ان سے دوری محسوس ہوئی ہو۔ یہ رابطہ کچھ تو رضیہ آپا کی وجہ سے قائم تھا اور کچھ ان علمی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے جن میں انکی عدم موجودگی کے باوجود انکی روح جھلکتی نظر آتی تھی انھوں نے ہندوستان کے ادبی ارتقا میں اپنی علمی اور تنظیمی صلاحیتوں سے جو رنگ بھرا ہے اسے ادب اور خاص کر اردو ادب کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پندرہ سال پہلے میں نے ایک مضمون ان پر لکھتے ہوئے حسب ذیل جملے لکھے تھے۔ آج بھی ان باتوں کو ان جملوں پہ ختم کرنا چاہتا ہوں کیونکہ انکی صداقت آج بھی ماند نہیں ہوئی ہے میں نے لکھا تھا

"ہندوستان اور پاکستان کے ترقی پسند ادب کی تحریک کو جس کے فرد واحد کی تنظیمی اور ادبی صلاحیتوں نے سب سے زیادہ آگے بڑھایا وہ سجاد ظہیر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجتماعی تحریکوں اور اداروں کو بھی افراد کی رہنمائی اور جوش کی ضرورت ہوتی ہے حالانکہ افراد کی طاقت جماعت ہی سے حاصل ہوتی ہے، اس لئے ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالنے، اس پر مضبوط عمارت کھڑی کرنے، عمارت کو آراستہ کرنے، اس کے رہنے والوں میں اسکی محبت اور حفاظت کا جذبہ پیدا کرنے اور اس کے حدود میں اضافہ کرنے کا کام زبردست تعمیری صلاحیت چاہتا ہے جب اس میں سجاد ظہیر کے دوسرے سیاسی اور علمی کارناموں کو جوڑ لیا جائے تو ان کی شخصیت کا وہ خاکہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے جس سے فکر و عمل کے ایک مخلص رہنما کے خط و خال بنتے ہیں"۔

ڈاکٹر محمد حسن :

سجّاد ظہیر کی ادبی خدمات

سنہ ۳۰ء سے کچھ پہلے ہی قومی اور بین الاقوامی سطح پر نوجوانوں میں ایک نیا شعور انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ قومی سطح پر اجتماعیت کے ردعمل کے طور پر انفرادیت کا عروج ہوا۔ عدم تشدد اور آئینی طریق کار کے ردعمل کے طور پر انارکزم اور انفرادی دہشت پسندی عام ہوئی اور عقلیت پرستی کے بجائے جذبات۔ ہندوستان میں گاندھی جی کی رہنمائی میں چوری چورا کی عدم تشدد کی تحریک کی ناکامی نے بھگت سنگھ کو جنم دیا۔ انفرادیت پسندی نے مرد کامل کا تصور ابھارا جو اقبال کے مرد کامل اور پریم چند کے تصوراتی ہیرو کی شکل میں ظاہر ہوا۔ عالم گیر سطح پر سرمایہ دارانہ جمہوریت کے متبادل راستے ڈھونڈے جانے لگے اور اس کوشش نے یوروپ میں مارکس کو دریافت کیا اور دوسرے گروہ نے فسطائیت کی طرف رُخ کیا نوجوانوں میں ایک عجیب سی خلش تھی ایک بے نام بیقراری جو زندگی بھر کا تصور اپنانے کا ارمان رکھتی تھی زندگی کا کوئی ایسا تصور جو عام انسانوں کی بہتری کی سبیل پیدا کر سکے اور جبر و استبداد کی جگہ خیر اور فلاح عام کے تقاضوں کو پورا کر سکے

رومان اور حقیقت کی یہ کشمکش۔ مدت تک جاری رہی۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی زمانہ میں اٹلی میں فسطائیت اور جرمنی میں نازیت کا عروج بھی ہوا اور دمیتروف کا عہد ساز مقدمہ بھی چلا جس کے نتیجہ کے طور پر دمیتروف نے سزا بھگتی۔ مگر اپنے دفاع میں کہا ہوا اس کا ایک ایک لفظ نوجوانوں کیلئے کبھی نہ بجھنے والی چنگاری کی طرح فروغ پذیر ہوا اور ایک نئے ولولے اور حوصلے کا محرک بن گیا

رومانویت کے حسین دھندلکوں میں کھوئے ہوئے ادیبوں کو ایک نئی صبح کی بشارت ملی اور خواب دیکھنے والے ہزاروں لاکھوں دانشور مصنف، شاعر اور فنکار اپنی زندگی کو نئی معنویت سے ہمکنار ہونے لگے بقول مجاز کلوں میں رہنے والے جھونپڑیوں کے خواب دیکھنے لگے اور جمہور کے دبے کچلے ہوئے طبقوں سے انھیں اپنا رشتہ استوار ہوتا نظر آنے لگا

جو نوجوان ہندوستان کے ساحل سے دور خیر و شر کا یہ تماشہ دیکھ رہے تھے انکی آنکھوں کے سامنے یہ منظر اور زیادہ صاف تھا ان میں اکثر نوجوان، سے تھے جنھوں نے مارکسزم کا ایک فلسفہ یا سیاسی حکمت عملی کی حیثیت سے بغور

بغور مطالعہ بھی نہیں کیا تھا لیکن جو چیز انھیں کشاں کشاں اس محاذ کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی وہ جاں بازی کا ایک رومانی جذبہ تھا جس کے رشتے اس جذبے سے ملتے تھے جس کے تحت بائرن نے یونانی جنگ آزادی میں شرکت کی تھی

مجازؔ نے طفلی کے خواب میں اسی جذبے کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے

طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں
اک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں
دل ہو اسیر گیسوئے عنبر سرشت میں
الجھے انہی حسین سلاسل میں ہم بھی ہوں
اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں
چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغ آب دار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

رزم و رومان کا یہ حسین مرکب اس دور کے نوجوان کی نفسیاتی کشمکش کا نشان ہے

سجاد ظہیر کا تعلق بھی رزم و رومان کے انھیں بانکوں کے قبیلوں سے تھا وہ جس خاندان کے چشم و چراغ تھے اس کی وجاہت کا اندازہ لگانا آج کی نسل کے لیے دشوار ہے سر وزیر حسن اپنے زمانے کے سربرآوردہ وکیلوں میں تھے جن کا نام سر تیج بہادر سپرو کے پائے کے وکلا کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ مسلم سیاست پر ان کا زبردست اثر تھا اودھ میں ان کا طوطی بول رہا تھا اور مسلمانوں کے متمول طبقے میں ان کے خاندان کا نام عزت اور احترام سے لیا جاتا تھا اودھ منزل اودھ کی مشہور کوٹھیوں میں سے ایک تھی اور ان کے سبھی سپوت اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

سید سجاد ظہیر انگلستان میں زیر تعلیم تھے اسی زمانے میں جب حسن کی لطیف نمازت سے دلوں کے جل بھنے کے دن تھے سیاست نے ایک نئی قندیل روشن کی سجاد ظہیر کے بارے میں مشہور ہے کہ نوجوانی میں محبوب کی یاد میں موم بتی کی روشنی میں دیوان حافظ جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ دروغ بر گردن راوی۔ زندگی کی اچھی اور خوبصورت چیزوں سے انھوں نے آخری سانس تک محبت کی اور ٹوٹ کر محبت کی۔ ان کے کردار کے اسی رومانی پہلو کی مدد سے انکی مروت، کامرانی اور ناکامیابی کو سمجھا سکتا ہے ——— پہلی بار "انگارے" کے افسانوں سے "جانے پہچانے گئے" ان افسانوں میں کیا تھا۔ ایک بے قرار نوجوان کی تڑپ اور سرمستی جو سارے شکنجوں سے ٹکراتا ہے نغمہ میں جی بھر کے آستینیں پھیلا کے رقص کرنا چاہتا ہے وجد و رقص کی اس حالت میں

کبھی مذہب کے شکنجوں سے ٹکراتا ہے، کبھی سماج سے کبھی سیاسی اداروں سے۔ سجاد ظہیر کا یہ افسانہ "نیند نہیں آتی" انگارے سے منتخب کیا ہے۔ گویا یہ بکھرے ہوئے خیالات کا مجموعہ تھا۔ "شعور کی رو" ٹیکنیک کا پہلا تجربہ۔ میاں اکبر کی آپ بیتی ہے جو اس جیسے متوسط طبقے کے نوجوان کی ذہنی اور جذباتی سرگزشت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس سرگزشت میں جنسی اور سیاسی مسائل کا ایک عجیب و غریب مرکب ہے۔ پیچ پیچ میں سماجی بے انصافی اور مذہب کی تنگ نظری پر بے محابا چوٹیں بھی ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ عالم بالا کے مناظر بھی موجود ہیں دوزخ کی تصویر بھی اور داروغہ دوزخ کا کچا چٹھا بھی اللہ میاں جل شانہٗ تعالیٰ کا خیالی پیکر بھی

"یہ کون آرہا ہے میرے سامنے سے؟ اس کے پستان کاٹے جارہے ہیں۔۔ اے حضور آداب عرض ہے، اے حضور بھول گئے۔ ہم غریبوں کو، میں ہوں منی جان! کوئی ٹھمری، کوئی دادرا، کوئی غزل۔ اے ہے آپ تو جیسے ڈرسے جاتے ہیں حضور! یہ سانپ آپ سے کچھ نہیں بولیں گے۔ ان کا بھی عجب لطیفہ ہے۔ میں جب یہاں داخل ہوئی تو داروغہ صاحب نے کہا منی جان، سرکار کا حکم ہے پانچ بچھو تمہاری خدمت کیلئے حاضر کیے جائیں۔ میں حضور سہم گئی۔ بچپن سے مجھے بچھوؤں سے نفرت تھی میں حضور سہم گئی۔ میں نے حضور بہت ہاتھ پیر جوڑے مگر داروغہ صاحب نے کہا کہ سرکار کے حکم کی تعمیل ان پہ فرض ہے۔ تب میں نے کہا کہ اچھا آپ مجھے سرکار کے دربار میں پہنچا دیں۔ میں خود ان سے عرض داشت کروں گی۔ داروغہ صاحب بچارے بھلے آدمی ہیں۔ مجھے اپنے پاس بٹھا کر میرے گالوں پہ ہاتھ پھیرے۔ آخر کار راضی ہو گئے۔ پہلے تو مجھے کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ داروغہ صاحب نے کہا۔ اس وقت سرکار کو غسل کرا رہے ہیں۔ جب اس سے فرصت ہو گی تب میرا پیشی ہو گی میں نے جو یہ سنا تو کوشش کی کہ جھانک کر کچھ میں بھی دیکھ لوں مگر دروازے کے دربان موٹے مسٹنڈے دیو نے مجھے دھکا دے دے کر الگ کر دیا۔ خیر حضور، آخر کار میری باری آئی، میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔۔۔۔ خیر حضور یہ بھی سرکار نے فرمایا کہ سزا تو تجھے ضرور ملے گی کیونکہ اُن کا انصاف تو سب کے سب برابر ہے۔ مگر بجائے بچھو کے مجھے دو ایسے سانپ ملے جو بس میرے پستان چبایا کرتے ہیں"

سیاست کا تذکرہ ہے تو صرف اتنا کہا تھا گاندھی لکھنؤ آئے ہیں اور غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ کا چرچا ہے اور پھر آخری جملے " میں آزاد ہوں ہوا کی طرح سے آزادی کی آجکل ہوا بھی چلی ہے۔ پیٹ میں آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ ایسا کہ آزادی کے چکر میں ہیں۔ موت یا آزادی۔ نہ مجھے موت پسند ہے نہ آزادی کوئی میرا پیٹ بھر دے

پھر لندن کی ایک رات، ناولٹ چھپا، سجاد ظہیر نے لندن کے اُن فراروں کی تصویر کشی کی جو گویا دھویں اور کہرے کی اندھی سرنگ میں بند ہیں جن کے ارمان بہت سے ہیں مگر اُن کی زندگیاں مفہوم سے عاری اور معنی سے خالی ہیں کیونکہ ان کے رشتے نہ عوام سے ہیں، نہ زندگی سے وہ ایک بے نام خلا کے مسافر ہیں چاروں طرف خواب بکھرے ہوئے ہیں حسین اور دلفریب اور پھر ان خوابوں کی تعبیریں تلاش کرنے کا شدید کرب، یہاں بھی سیاست اور محبت کا امتزاج ہے بلکہ یوں کہیے کہ دونوں پیش منظر ہے تو سیاست پس منظر یا محض بین السطور کی حد تک لیکن اکبر میاں کو نعیم کی طرح زندگی کا یہ نیا ادراک حاصل نہیں ہوا تھا یہ نیا ادراک یہ تھا کہ زندگی اور محبت کی چھوٹی خوشیوں کے راستے میں بھی جو رکاوٹیں ہیں وہ صرف اسی صورت میں دور ہو سکتی ہیں جب ہم معصوم ہو ہمیں اپنے کو ہر قسم کی سماجی بے انصافیوں سے جدوجہد کرنیوالی عظیم عوامی تحریک کا حصہ بنا لیں۔

"ہمارے لئے زندگی کی اور کوئی دوسری صورت نہیں دوسرے راستے ہیں ہمیں
روحانی موت کے خشک ریگستان میں لے جاکر چھوڑ دیتے ہیں جہاں سے
نکلنے کا کوئی راستہ نہیں"

بیمار ڈرامہ ہے۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے وہ لندن کی ایک رات سے مماثل ہے ان تمام تخلیقات پر صرف ایک سوال منڈلاتا نظر آتا ہے۔ "کیا انسان کی ذہنی اور جذباتی خلیش انفرادی سطح پر حل ہو سکتی ہے؟" اس منزل تک تک پہونچتے پہونچتے سجاد ظہیر اس کا جواب نفی میں پاتے ہیں اور آہستہ آہستہ تمام سماجی ناانصافیوں کو للکارنے والے ایک اجتماعی ہمہ گیر تحریک پر ان کا اعتماد بڑھتا جاتا ہے اس منزل تک آتے آتے گویا سجاد ظہیر نے بورژوا دانشور کی نظروں سے مارکسی انقلاب کے تصور تک دسترس حاصل کی تھی اور اعتماد اور ایثار کے اس جذبہ کے ساتھ۔

"شیلا۔ مجھے ڈراؤ مت۔ میرے پاس تمہارے
سوالوں کا کوئی جواب نہیں، سوائے کوشش اور امید
کے ہر ممکن کے قریب ناممکن کی بھیانک شکل منڈلایا
کرتی ہے اگر ہم اس کو اپنے دماغ میں جگہ دیں تو موجودہ
اور آنے والی دونوں زندگی بدمزہ اور ناقابلِ برداشت
ہو جائے گی۔"

"لندن کی ایک رات" صفحہ ۱۲۳، دوسرا ایڈیشن۔ آزاد کتاب گھر دلی اس کے بعد کی داستان سب جانتے ہیں سجاد ظہیر ایک بدلے ہوئے نوجوان کی شکل میں ہندوستان پہونچے۔ یوروپ کے اشتراکی حلقوں سے ان کے رشتے استوار ہو چکے تھے سماجی بے انصافی کے خلاف ایک ہمہ گیر اجتماعی جدوجہد کا تصور انھیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا اس جہادِ عظیم میں ادیبوں کی شرکت لازمی تھی۔ اس لئے نہیں کہ اس سے یہ محاذ مضبوط ہوگا اس سے کہیں زیادہ اس وجہ سے کہ اسی تحریک اور جدوجہد میں ادب اپنی زندگی کا مفہوم اور معنویت پا سکے گا اور سماج سے کٹے رہنے اور اپنے سوالوں کے جوابوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جانے کے احساس

ترقی پسند تحریک کا نقطہ آغاز یہی تھا

اس مرحلہ پر متوسط طبقہ کے بعض دانشوروں کے نقطہ نظر کو سمجھنا ضروری ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام کے معاشرے میں رہتے ہوئے اسکی تمام ترخرابیوں کے خلاف جد وجہد کرتے تھے وہ پرولتاریت کی بت شکنی کے ذریعہ گویا اپنا انتقام سرمایہ دارانہ نظام سے لینا چاہتے تھے لیکن پرولتاری زندگی گذارنے کی ہمت نہ رکھتے تھے اسی لئے وہ انقلابی حیثیت سے تربیت چھوڑتے ہوئے بھی اور اسی سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود مزدوروں اور کسانوں کی عام زندگی سے مختلف زندگی گذارتے تھے۔ ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو اپنے طبقہ کے دائرے سے باہر نکال سکے۔

ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کانفرنس سے باقاعدہ شروع ہوئی۔ سجاد ظہیر ادیب کی حیثیت سے کہیں زیادہ منتظم اور تحریک ساز کی حیثیت سے نمایاں ہوئے ترقی پسند تحریک کے بنیادی نظریات کیا تھے وہ کس حد تک ادبی تھے درکس حد تک سیاسی؟ اس کے بارے میں تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں لیکن خود سجاد ظہیر کے ذہن میں اس بارے میں کون سی باتیں بنیادی تھیں اس کا اندازہ روشنائی کے ان اقتباسات سے ہو سکتا ہے

> اس اعلان کا لب لباب دو لفظوں میں آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی ہے۔ حیات انسانی کے نمو اور ترقی سے لگاؤ ہے کم از کم اس شرط کو ماننا اس کے لئے ضروری ہے دوسرے لفظوں میں ایک ادیب بیک وقت وطن کی آزادی اور جمہوریت کا مخالف اور ترقی پسند ہے تو اس کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے وہ ہندومت یا اسلام کے مذہبی تصور کو اپنائے۔ چاہے افلاطونی فلسفہ کو صحیح مانے چاہے تصوف اور ھیگیت کو چاہے مارکس کی جدلی مادیت کو چاہے گوتم بدھ کے نروان کے تصور کو یا مہاتما گاندھی کی اہنسائیت کو اسے اختیار ہے کہ وہ اپنی ادبی کاوشوں میں وہ ان میں سے کسی بھی یا ان کے علاوہ کسی اور فلسفہ یا عقیدے کی ترویج و تبلیغ کرے

روشنائی صفحہ ۱۵۲، آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۹

> اگر کوئی لیکھک منوسمرتی کا حوالہ دے کر ذات پات کی وحشیانہ تفریق کو آج بھی صحیح مانتا ہے اور اپنی تحریر میں ان تصورات کی ترویج کرتا ہے یا کوئی دوسرا شاعر اسلام کا نام لے کر اس ملک کے رہنے والے مختلف فرقوں کے مابین نفرت پھیلاتا ہے تو کیا ترقی پسند ادیب یہ کہہ سکتے ہیں

کہ چونکہ یہ باتیں اس شخص کے مذہبی عقائد سے تعلق رکھتی ہیں جس پر قائم رہنے
کا پورا اختیار ہے اس لئے ایسے ادیبوں کو بھی ترقی پسندوں میں شمار کیا جا
سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا .... ہمیں لوگوں کے عقائد و
خیالات اور عمل کو اس طرح جانچنا ہو گا کہ ہمارے موجودہ معاشرتی مسائل
پر ایک خاص خیال یا فنی تخلیق کس طرح سے اثر انداز ہوتی ہے اگر کسی تخلیق
سے زندگی نکھرتی اور سنورتی ہے تو اس کا مصنف ہمارے قبیلے میں سے ہے

روشنائی صفحہ ۱۵۲، ۱۵۳

"ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مصنفوں میں بہ یک وقت کئی قسم کے رجحانات
ہوتے ہیں۔ بعض باتوں میں ترقی پسندی جھلکتی ہے ...... بعض
نظریے ایسے ہوتے ہیں جن میں الجھاؤ ہوتا ہے جو رجعت پسند تک ہوتے ہیں
ایسے مصنفوں کی تحریر کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ان کا مجموعی اثر اچھا
ہے، لطیف ہے ... اس سے کسی حد تک بھی معاشرتی یا انفرادی حقیقت
پر اس طرح روشنی پڑتی ہے جس کی مدد سے انسان زیادہ دیکھ سکتے ہیں تو
ہمیں ایسے مصنفین کے رجعتی پہلوؤں کو رد کر کے ان کے حیات آفریں پہلوؤں
کو اپنانا چاہیئے

روشنائی صفحہ ۱۵۳

ان اقتباسات سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ آزادی پسندی اور جمہوریت پسندی ترقی پسندی کی بنیادی اقدار قرار دی گئی تھیں دوسری یہ کہ ترقی پسند خیالات سے وہ خیالات مراد ہیں جو معاشرتی مسائل پر اثر انداز ہو سکیں اور سماج کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوں۔ تیسری یہ کہ ایک ہی مصنف میں مختلف رجحانات ہو سکتے ہیں۔ جن میں سے بعض ترقی پسند اور بعض رجعت پسند ہو سکتے ہیں اور اس مصنف کے ترقی پسند ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ اسکی تخلیق کے مجموعی اثر کی بنا پر کیا جائے گا یہ آخری بات اپنے زمانے کے ادیبوں سے کہیں زیادہ ماضی کے ادیبوں پر صادق آتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ متعلقہ زمانے کی سماجی تاریخ کے گہرے مطالعہ کی مدد سے کسی ادیب کے افکار و اقدار کا محاکمہ کیا جائے سماجی اقدار سے باخبر جدید آگاہ تنقید رواج پائے ——— سجاد ظہیر عملی تنقید کے ان جان لیوا تقاضوں کو پورا نہ کر سکے اور ان پر جو اعتراضات بعد میں وارد ہوئے اس کا سبب یہی تنقیدی مسلک تھے بنیاد حیدر کی چلتی ہوئی نظروں کو انھوں نے وقتی تقاضوں کے پیش نظر ان سے کہیں زیادہ اہم تخلیقات پر ترجیح سماجی تنقید کے لئے زیادہ گہرے تجزیے وسیع تر اور زیادہ گہرے ہمہ گیر مطالعے اور اسکالرشپ کی ضرورت تھی عملی تنقید کے میدان میں ان کی تمام فروگذاشتیں تسلیم مانا کہ تنقید نگار کی حیثیت سے ان کا درجہ بلند نہیں ہے تسلیم وہ ادبی محاکموں میں غلطی کر سکتے تھے۔ مگر تنگ نظری اور کٹھ ملائیت ان میں نہ تھی اسی لئے جب مرزا شوق کی مثنوی پر منشی رلح رہبر کا مقالہ چھپا اور حافظ کی غزل پر الٹی سیدھی بحثیں تصوف کے سیاق و سباق میں چلیں تو انھوں نے ان دونوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مرزا شوق کی مثنوی پر ان کا مقالہ بہت عالمانہ نہیں لیکن اس سے نیا انداز نظر ضرور

ان کو اصرار ہے کہ اس بات پر کہ مرزا شوق کو انہیں کے زمانے کے مسائل کو نظر میں رکھنا چاہیے جس زمانے میں یہ مثنوی لکھی گئی اس زمانہ میں رفیق حیات کے انتخاب کی آزادی کے لیے سماج کے تعصبات و توہمات سے ٹکرانا ترقی پسندانہ اقدام تھا اور مثنوی میں زوال آمادہ تعیش پسندی کے بجائے اسی بت شکن آزادی کے جذبے کو تلاش کرنا چاہیے۔

حافظ کی شاعری پر انھوں نے پوری کتاب لکھی "ذکر حافظ" یہاں بھی وہ عاشق زیادہ ہیں۔ عارف کم حافظ پر ان کی نظر کم عالمانہ ڈھنگ سے نہیں پڑتی ہے۔ وہ تصوف میں انسان دوستی طبقے کا روپ دیکھتے ہیں تصوف سکہ بند مذہبی رسوم کو رد کرتا ہے اور انسانوں کو مذہبی بنیاد پر تقسیم کرنے کے بجائے ان میں ایک جہتی اور جمہوری مساوات قائم کرتا ہے تصوف کے اسی ترقی پسندانہ روپ پر ذکر حافظ میں اصرار کیا گیا ہے اور تصوف کی زوال آمادگی اور توہم پرستی کو رد کر کے اس کی صحت مندانہ روایات پر زور دیا گیا ہے!

ان کی تخلیقات میں "پگھلا نیلم" کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے یہ ان کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے ان نظموں میں آنکھیں چکا چوند کرنے والی شاعری نہیں لیکن تجربے کی حیثیت سے ان کی بڑی اہمیت ہے

مثال کے طور پر ان کی یہ نظم ملاحظہ ہو عنوان ہے "دریا"

آؤ میرے پاس آؤ۔ نزدیک
یہاں سے دیکھیں
اس کھڑکی سے باہر
نیچے اک دریا بہتا ہے
دھندلی دھندلی تصویروں کا
خاموشی سے بوجھل
زخمی سایوں میں
تیر چھپائے، تھرتھراتے، جلتے
کناروں کے پہلو میں
بے کل دکھی
اسے بھی نیند نہیں آتی!

پوری نظم ایک سمبل ہے اور اس سمبل پر سے صرف ایک "لفظ" بھی نے نقاب ہٹا دی ہے اس بیقراری کے پیچھے صرف شاعر کی نہیں شاید پوری کائنات کی کہانی جلوہ گر ہے اور کس رومانی رنگینی کے ساتھ

ان کی شاعری کی یہی خصوصیت ہے اس میں رومانی نوجوان کے خوابوں کی سی رنگینی اور رجائیت ہے ارمان اور امید ہے۔ کبھی وہ اس "باڑھ" کی امید میں گیت گاتے ہیں جو ساری دنیا سے نفرت اور ظلم کو بہا لے جائیگی اور انسانوں کے دلوں کو معصومیت کا سویرا بخش دے گی کبھی مائیکا نسکی کی زبان سے دھرتی کے انسانوں کو گنگارن اور ننی نوف کی طرح

کی طرح اور چاند چھونے کا ارمان کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں صفات اور تشبیہات کا استعمال بہت ہے اور غزل کی لڑیوں کو اپنے سے وہ نہیں ہٹاتے لیکن بحر اور قافیہ کی مدد کے بغیر بھی ان نظموں میں ایک نرمی، شائستگی اور لطافت قائم رکھی گئی ہے۔ جو سجاد ظہیر کی درد مندی انسان دوستی اور حسن دوستی کا پرتو ہے۔ یہی نقطۂ نظر "ذکرِ حافظ" کے تنقیدی رویے میں ظاہر ہوا ہے وہ لکھتے ہیں

"ایک بڑا شاعر انسان اور اس کے حالات کے ساتھ صرف ہمدردی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی شاعری سے ہمارے دلوں میں ایسا پاکیزہ ہیجان پیدا کرتا ہے جو ہمیں نوعِ انسانی کے ساتھ مہر و محبت کے رشتوں کو اور بھی استوار کرنے کے لئے آمادہ اور مستعد کر دیتا ہے۔ وہ ہمارے مزاج میں زندگی کے خطرہ اور حسن کے احساس کو بڑھا کر طبیعتوں میں ایسا گداز اور ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے جو ہمیں صدق و صفا کی جستجو کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ وہ ہمیں ایک لطیف طریقے سے بدل دیتا ہے تاکہ زیادہ حساس اور روشن ضمیر بن کر اجتماعی اور انفرادی زندگی کی بہتر اور زیادہ طمانیت بخش تنظیم کی سعی اور جد و جہد ہم ہماری نظر بلند ہو اور ہمارا قدم راست شاعری کا بزرگ ترین منصب یہی ہے!

(ذکرِ حافظ - مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۲-۱۹)

اس ضمن میں انھوں نے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ ادب میں "ہم جنھیں اعلیٰ قدروں سے تعبیر کرتے ہیں وہ ایسی سچائیاں ہوتی ہیں جن میں ابھی تک بہت کم تبدیلیاں ہوئی ہیں یا اگر ہوئی بھی ہیں تو سادگی سے زیادہ پیچیدگی کی جانب ہوئی ہیں لیکن ان کی نوعیت نہیں بدلی ہے۔ اسی وجہ سے یہ بالکل ممکن ہے کہ تین ہزار سال پہلے کے کسی قبائلی انسان کا برہ گیت آج بھی ہمارے لئے جذباتی معنویت رکھے اور ہمیں متاثر کرے لیکن اسی انسان کے سورج دیوتا کی عقیدت میں گائے ہوئے نغمے ہمیں جذباتی طور پر متاثر نہیں کریں گے" (ذکرِ حافظ صفحہ ۱۳۰)

حافظ نے عشق و محبت کے زمزمے گائے اور اس انداز سے گائے کہ عشق و محبت کے سامنے عقل و علم کو خوار و زبوں قرار دے ڈالا۔ جو بظاہر سجاد ظہیر کے نزدیک جس عقل اور علم کا مذاق حافظ نے اڑایا ہے وہ اپنے دور کے ارباب اقتدار اور دنیا کاروں کے علم کا مذاق ہے کیونکہ یہ عقل اور علم انسانوں کے لئے سچی مسرت حاصل کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں یا رکاوٹیں بنانے کے کام میں لائے جاتے ہیں!

حافظ کے نزدیک وہ قوت اور تحریک جو انسانوں کو اخلاقی، روحانی اور حیاتی طور سے سرور و انبساط بخشتی ہے اور ان کے باہمی تعلقات کو حسین اور پر لطف بناتی ہے، محبت و انس ہے۔ وہ محبت اور رفاقت کی فراوانی اور شدت کا مطالبہ کرتا ہے۔ تمام وہ چیزیں، ادارے، افراد اور اخلاقی و فلسفیانہ تصورات

اور رفاقت کی فراوانی اور شدت کا مطالبہ کرتا ہے۔ تمام وہ چیزیں ادارے افراد اور اخلاقی و فلسفیانہ تصورات اور عقیدے جو شعلۂ عشق کی حدت کو کم کرتے ہیں، جو انسان سے انسان کی رفاقت کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں یا اسے منغص اور آلودہ کرتے ہیں حافظ کے نزدیک قبیح اور مذموم ہیں... اس کے برخلاف تمام وہ چیزیں اور حالات جو محبت و مودت میں اضافہ کرتے ہیں، جن سے حیات انسان سے حاصل ہونے والی لذتوں کی پاکیزہ اور حسین تکمیل ہوتی ہے جو انسانی تعلقات میں لطف و سرور پیدا کرتے ہیں حافظ ان کا پر جوش حامی اور طرفدار ہے! وہ اسکو تسلیم کرتے ہیں کہ حافظ نے اپنے دور کے امراء کی تعریف میں اشعار بھی لکھے اور اس کے کلام میں جابجا سخت قسم کی تقدیر پرستی اور دنیا کو فانی اور ہیچ جاننے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے مگر اس کے باوجود حافظ کی شاعری کا اصلی جوہر یہ منفی میلانات ہیں نہ وہ عیش کوشی ہے جسے غلطی سے عیاشی کے ہم معنی سمجھ لیا گیا بلکہ محبت کی وہ پاکیزگی ہے جو تہذیب نفس کا عظیم کارنامہ ہے کہ وہ حیاتی لذت کو ایک بلند تر اور لطیف تر سطح پر لے جا کر گویا جسم و روح دونوں کا تزکیہ کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> حافظ پر عیش پرستی کا الزام لگانے والوں کو غور کرنا چاہیے کہ محبت
> کے جذبے کو اس کو جبلی سطح سے بلند کر کے اس میں شرافت، رفاقت
> اور ایک طرح کی روحانی سرفرازی کے احساسات اتنے حسین اور لطیف
> طریقے سے پیدا کرنا کیا انسان کی تہذیب نفس کا ایک عظیم کارنامہ نہیں ہے

اس سے اندازہ ہوگا کہ سجاد ظہیر شاعر ہی نہیں تھے تنقید میں بھی شرافت، رفاقت اور روحانی سرفرازی کی اقدار کی تلاش پر زور دیتے تھے!

آزادی کے بعد کے دور میں سجاد ظہیر زیادہ تر کانفرنسوں اور سمی ناروں کے ہو کر رہ گئے تھے افرو ایشیائی ادیبوں کی تنظیم میں خاص طور پر انھیں دلچسپی تھی

آزادی سے قبل ہر مکتبۂ خیال کے ادیبوں کو سامراج دشمنی کی سطح پر جمع کر لینے میں انھیں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ آزادی کے بعد کے دور میں نہیں ہوئی۔ بہت سے سانقیوں اور نیاز مندوں کو بھی ان سے بنیادی معاملات میں اختلاف تھا لیکن ان اختلافات کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے بعد وہ اردو ادب کی سب سے بڑی ادبی تحریک کے بانی اور محرک تھے اور ترقی پسند تحریک کی طرح سجاد ظہیر بھی ہماری ادبی تاریخ کے آئینہ خانے میں زندہ رہیں گے

بقیہ : بنے بھائی — ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد

میری یہ مختصر بات چیت بنے بھائی کی علمی ادبی یا سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں نہیں ان کی شاعری کے متعلق نہیں، ان کی نثر نگاری کے متعلق بھی نہیں ہے یہ محض ایک یاد ہے۔ اس محبوب کی جسے ادب کی ترقی پسند تحریک میں امیر کارواں کا رتبہ حاصل تھا اور ہم جسے پیارے بنے بھائی کہتے تھے، بنے بھائی جو آج ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں جن کے جانے سے ملک کی ادبی فضا بہت اداس ہے جن کے جانے سے ہماری نگاہیں اداس اور ویران ہیں اور جنھیں اب ہم کبھی نہ دیکھ سکیں گے

ع ہمیشہ رہے نام اللہ!

مرا سلام تمہیں اے مجاہدانِ حیات

ساحر لدھیانوی

یہ سرفروش، یہ صبحِ حیاتِ نو کے نقیب
اندھیری شب میں لہو کے دیئے جلائے ہوئے
بلند و پست جہاں کے تضاد زاروں میں
کہیں حیات، کہیں موت بن کے چھائے ہوئے
سروں پہ پھانسی کی رانی کا ہاتھ سایہ فگن
لبوں پہ شعلۂ کیتوّر مسکرائے ہوئے
دہکتے ہاتھوں میں جلیان والا باغ کی خاک
رگوں میں خونِ بھگت سنگھ طپش کھلائے ہوئے
جبیں پہ نور روایاتِ انقلابِ فرانس
دلوں میں روس کا عزمِ جواں جگائے ہوئے
نظر میں چین کے باغی مجاہدوں کا جلال
نفس میں آتشِ ہسپانیہ چھپائے ہوئے
یہ ارتقا کے سپاہی، حیات کے جانباز
ہر اک معرکۂ حق میں کام آئے ہوئے
لہو میں بھیگی ہوئی پھانسیوں کے سائے میں
علم اٹھائے ہوئے آستین چڑھائے ہوئے
نئے نظام، نئے دور کی بشارت سے
فقیہ و میر و سلاطیں کی نیند اڑائے ہوئے
حقیقتوں کے پیمبر، مشینوں کے رقیب
نقابِ چہرۂ ارض و سما اٹھائے ہوئے
فنا کے آہنی قدموں کے شورِ پیہم میں
سرودِ بربطِ ہستی کی لے بڑھائے ہوئے
بشر کی قوت و عظمت کے زمزمے گاتے
زمیں کے در پہ جبینِ فلک جھکائے ہوئے

مرا سلام تمہیں اے مجاہدانِ حیات
حیات، آج تم ہی سے ہے لو لگائے ہوئے

سبط حسن

پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کا مسیحا

حیات اور موت کا رشتہ ابدی ہے اور ہم سب جو زندہ ہیں ہر لمحہ موت ہی کی طرف سفر کر رہے ہیں، البتہ اس سفر کی نوعیت کا فیصلہ کرنا ہمارے اختیار میں ہے اور یہی کہ ہم اپنا سفر حیات بخش قوتوں کے ساتھ طے کریں یا موت کی قوتوں کے سائے میں جینے کے ہی دو ہی طریقے ہیں ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی جب زندہ رہے زمین کا بوجھ بنا رہے اور لوگ اس سے پناہ مانگتے رہیں حتیٰ کہ اس کا جنازہ بھی وبال دوش ہو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان جب تک زندہ رہے دوسروں کی زندگی کا سہارا بنا رہے اور مرتے وقت نہ اپنی ذات سے نادم ہو اور نہ دنیا والوں سے شرمندہ

سجاد ظہیر جن کو ہم سب پیار سے بنے بھائی کہتے تھے بڑی آن بان سے جیے اور بڑی شان سے اس دنیا سے رخصت ہوئے ۔ انھوں نے ایک بھرپور زندگی گذاری تمام عمر سچائی، انصاف، اور انسانیت کی قوتوں کا ساتھ دیا اور بدی بے انصافی انسان دشمنی، ذہنی اور مادی غلامی، غرضیکہ ان تمام قوتوں سے لڑتے رہے جو موت اور زوال کی نشانیاں ہیں

بنے بھائی نیکی اور صداقت تھے اسی لئے اُن کے ساتھ رفاقت کا رشتہ جوڑنا بہت آسان تھا اُن کا دل بقول غالبؔ مہر و وفا کا باب تھا اس دروازے پر نہ کوئی حاجب و دربان تھا اور نہ خشتی کا روک کی ضرورت ہوتی تھی ۔ اسی لئے پاکستان کیا اس شہر میں آپ کو ایسے لوگوں کی کافی تعداد ملے گی جو انکی شائستگی شرافت اور خلوص کے معترف ہوں گے

اگر میں کچھ ایسی باتیں کہوں جسمیں خود نمائی کی جھلک نظر آئے تو امید ہے کہ آپ لوگ مجھے معاف کردیں گے کیونکہ انکی ذات سے وابستگی میں عام طور سے من و تو کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور ہر شخص یہی محسوس کرتا تھا کہ میری ذات سجاد ظہیر کی ذات کا ایک جزو ہے !

بنے بھائی کی ادبی زندگی کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کی بنیاد رکھنے اور اس کو آگے بڑھانے میں انھوں نے بڑا تاریخی کردار ادا کیا ہے انکی تحریروں نے ادیبوں کے طرز فکر و احساس پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے چنانچہ انکی ادبی خدمات کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں لیکن انکی شخصیت کا سیاسی پہلو اب تک زیادہ اجاگر نہیں ہوا ہے ۔ وہ طالب علمی کے زمانہ میں کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہوئے اور مرتے دم تک اسی سے وابستہ رہے وہ ایک نہایت خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی تعلیم کے باعث بڑی آسودہ اور پرچشم زندگی بسر کرتے تھے لیکن انھوں نے انقلابی جد وجہد کی پرخار وادی میں قدم جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر رکھا تھا ۔ انھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کہ انکی آبلہ پائی نے کتنے کانٹوں کو گلنا رنگ بنایا ہے وہ آگے ہی بڑھتے رہے !

جولوگ بنے بھائی کے مزاج کی نرمی، احساس اور نفاست سے واقف اور فنون لطیفہ سے انکی والہانہ محبت سے آگاہ تھے ان کو بنے بھائی کی سیاسی مصروفیتیں کبھی کبھی بڑی حیرت انگیز ہوتی تھی۔ کیونکہ کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لینا یا پارٹی کی تنظیم کے لئے دوڑ دھوپ کرنا بظاہر بڑا غیر شاعرانہ فعل معلوم ہوتا ہے وہ سوچتے تھے کہ اتنا نفاست پسند شخص مزدوروں اور کسانوں میں گھل مل کر کس طرح کام کر سکتا ہے ادب اور پارٹی کی سیاست انکو دو متضاد چیزیں نظر آتی تھیں۔ مگر سجاد ظہیر کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ لوگ جو اپنے کو روشن خیال اور ترقی پسند سمجھتے ہیں کمیونسٹ کیوں نہیں ہو جاتے۔ وہ کہتے تھے کہ میں ترقی پسند ادیب اس لئے ہوں کہ کمیونسٹ ہوں اور کمیونسٹ اسی لئے ہوں کہ ترقی پسند ہوں وہ ان دونوں حقیقتوں کو ایک دوسرے کی ضد نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک دوسرے کا منطقی نتیجہ تصور کرتے تھے!

انھوں نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری جنرل کا عہدہ بڑی پریشان کن حالت میں سنبھالا تھا۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے بھی کمیونسٹ پارٹی کے دفتر لاہور، کراچی، پشاور میں موجود تھے لیکن سب سے فعال پارٹی پنجاب کی تھی البتہ اس پارٹی کے بیشتر رہنما سکھ تھے۔ سردار سوہن سنگھ جوش، سردار تیجا سنگھ سوتنتر، سردار کرن مان سنگھ مان وغیرہ۔ ان میں سے بعض کا تعلق غدر پارٹی سے رہ چکا تھا۔ بعض مولانا عبیداللہ سندھی اور مولوی برکت اللہ مرحوم کے ساتھ کام کر چکے تھے اور دس دس پندرہ پندرہ سال قید رہے۔ ملک تقسیم ہوا تو ان لوگوں کو ہندوستان جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا۔ سجاد ظہیر کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے تین سال کی مختصر مدت میں کمیونسٹ پارٹی کے بکھرے ہوئے تاروں کو نہ صرف از سر نو جوڑا بلکہ نئے کارکنوں کی سیاسی تربیت کر کے اس نوزائیدہ پارٹی کو ایک نہایت باعمل اور منظم جماعت میں تبدیل کر دیا۔ سجاد ظہیر کو پاکستان کے حالات کا مطالعہ کرنے کا بہت کم موقع ملا تھا روپوشی کی وجہ سے وہ عام لوگوں سے کیا خود پارٹی کے کارکنوں اور ہمدردوں سے بھی آزادی سے نہ مل سکتے تھے اس کے باوصف انکی شخصیت میں اس بلا کی کشش تھی کہ پارٹی کا ہر رکن ان سے ذاتی طور پر یگانگت اور اپنائیت محسوس کرتا تھا ہر شخص کو ان پر اور ان کے طریق کار پر پورا پورا بھروسہ تھا یہی وہ اوصاف تھیں کی بدولت وہ پارٹی کے اندر فکر و عمل کی وحدت کو فروغ دینے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت کمیونسٹ پارٹی سیسہ کی ایک دیوار تھی جسمیں گروہ بندیوں اور باہمی رقابتوں کے شگاف نہیں پڑے تھے!

سجاد ظہیر بنیادی طور پر ایک آرٹسٹ تھے وہ انقلابی سرگرمیوں کو بھی ایک آرٹسٹ کی نظر سے دیکھتے اور برتتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ انقلاب بھی نوساز ہستی کا حیات بخش نغمہ ہے، لہٰذا ہر انقلابی کارکن کا فرض ہے کہ جس طرح ایک موسیقار ستار کے مختلف تاروں کو حرکت دے کر ان کی آوازوں میں ایک آہنگ اور حسن پیدا کرتا ہے یا ایک پیانو بجانے والا پیانو کی پتیوں پر اپنی انگلیوں کی جنبش سے نئی نئی دھنیں بناتا ہے تا کہ لوگوں کا جمالیاتی ذوق نکھرے اور ان میں زندہ رہنے اور زندگی کو حسین بنانے کا ولولہ پیدا ہو اسی طرح ہم انقلابیوں کا بھی فرض ہے وہ اپنے عمل سے لوگوں میں زندگی سے محبت رکھنے، زندگی کی سچی اور حیات بخش اقدار کو ترقی دینے، زندگی کو زیادہ آسودہ آزاد اور باشعور بنانے اور انکی قوتوں سے بہرہ ور ہو سکیں صلاحیتوں کو ابھاریں جو انسانیت کے لئے ایک جان لیوا روگ بن گئی ہیں۔

سجاد ظہیر کی شخصیت مشرقی طرز احساس اور مغربی انداز فکر کا نہایت دلکش امتزاج تھی انھیں ہماری تہذیب کی صحت مند قدروں سے بڑا گہرا لگاؤ تھا اور وہ ان قدروں کا بڑا احترام کرتے تھے البتہ ان کے شعور و ادراک کے سوتے مارکسزم سے ملتے تھے!

وہ اردو کے غالباً پہلے ادیب ہیں انھوں نے اپنے ناول - لندن کی ایک رات میں - شعور کی موج دروں بہاؤ کو قلم بند کرنے کا تجربہ کیا وہ اشتراکی دبستان تنقید کے بانیوں میں تھے اور ان کے مضامین میں ترقی پسند ادب کے اصول تنقید کا بہت کامیاب اظہار ملتا ہے ان کی تحریریں ذاتی تعصبات سے بالکل پاک ہوتی تھیں وہ جو کچھ لکھتے بڑی دیانت داری اور خلوص سے لکھتے تھے لیکن انھوں نے کبھی کسی کی دلآزاری نہیں کی اور نہ کبھی ادبی رعونت دکھائی

سجاد ظہیر تمام عمر انسانی معاشرے کی نجات اور تکمیل ذات کیلئے کوشاں رہے یہ مرحلۂ شوق ابھی تک طے نہیں ہوا لیکن سجاد ظہیر نے جو شمعیں اپنے خون جگر سے جلائی تھیں ان سے نئے چراغ روشن ہوں گے اور نئی نسل کی کاروان حیات کی راہیں منور ہونگی

ملک راج آنند

سجّاد ظہیر

چند یادیں

ہائیڈ پارک لندن ۔ اتوار سہ پہر چوتھے دہے کا ابتدائی حصہ نیو کالج آکسفورڈ کا فیشن ایبل ویسٹ زیب گلو اسمارٹ نیوی بلیو سرج سوٹ زیب بدن، پہلے چہرے پر جوش و خروش کے آثار ۔ ہاتھ ہلا کر عبارت اخبار پکڑا ہوا نوجوان ہائیڈ پارک کے وسیع میدان میں جلسہ۔ برطانوی پارلیمنٹ کے پہلے کمیونسٹ ممبر شاپور جی سکلت والا کی تقریر۔ مجمع کے کنارے پر اخبار بیچنے والے اس نوجوان نے ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ مجھے ایک کاپی پیش کی تھماتے کاپی اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور اس کی قیمت ایک شلنگ ادا کر دی

"آپ ملک راج آنند ہیں نا"؟ اس نے لکھنؤ کے میٹھے لہجے میں پوچھا

"اور آپ"؟ میں نے پوچھا

"میں سجاد ظہیر ہوں" اس نے جواب دیا ۔ میں نے آپ کو کرشنا مینن کی انڈیا لیگ کے دفتر میں دیکھا تھا

ہم دونوں نے ہاتھ ملایا

اس وقت تک میں بیشتر ہندوستانی طالب علموں کا خلیفہ بن چکا تھا وجہ یہ تھی کہ فلسفہ میں تحقیقات ختم کرنے کے بعد میں لندن میں ٹھہرا رہا اور ناول لکھنے لگا چنانچہ مجھے علمی اور سیاسی معاملات میں تجربہ کار اور ماہر سمجھا جاتا تھا۔ میں نے سجاد ظہیر کو چائے پینے کی دعوت دی۔ سکلت والا کی ہائی پچڈ آواز ہائیڈ پارک میں اس زور سے گونج رہی تھی کہ پارک کے دوسرے کونوں پر مجمع مقرروں کی تقریر سننا مشکل ہو رہا تھا مگر ہم بخوبی جانتے تھے کہ سکلت کیا بولے گا ۔ اور جب ہمارا اندازہ صحیح ثابت ہونے لگا تو ہم ماربل آرچ کے قریب ایکسپریس ڈیری کی طرف روانہ ہو گئے

اس سے قبل میں یہ سن چکا تھا کہ سجاد ظہیر نے ایک افسانوں کا مجموعہ "انگارے" کے نام سے شائع کیا ہے جس نے شمالی ہند کے ادبی حلقوں میں کھلبلی مچا رکھی ہے چنانچہ میں نے سجاد ظہیر سے اس کتاب کی ایک کاپی پڑھنے کو مانگی

"مجھے آپ سے اور "انگارے" کے دوسرے لکھنے والوں سے ملنے کی بڑی خواہش تھی ۔ میں نے کہا

۔۔ ادھر ہم لوگ آپ کا ناول ۔ اچھوت ۔ پڑھ چکے ہیں ۔ آج کل " آکسفورڈ مجلس " کے ممبر ہمہ وقت اسی ناول کی باتیں کرتے رہا کیں ۔ ہم لوگ مصنفوں کی ایک انجمن بنائیں ترقی پسند مصنفوں کی " اس نے کہا

۔ سجاد ظہیر صاحب ۔ میں نے کہا ۔ آپ کے اور میرے خیالات ایک ہی پٹری پر دوڑ رہے ہیں، مگر ہمارے بیشتر احباب کو یا تو خود اپنی ذات میں دلچسپی ہے یا کرشنا مینن کے خلاف سازشیں کرنے میں ہر ہندوستانی ذی شعور خاص طور پر لندن میں محض دوسرے ہندوستانی ذی شعور کو چھوٹا ثابت کرنے میں کیا مصروف رہتا ہے اُن کو ایک انجمن میں مجتمع کرنا ممکن ہے ؟

" اردو مصنفین کو جمع کرنے کا ذمہ میرا ہے اور جناب مجھے لوگ بنے پکارتے ہیں ، یہی میری عرفیت ہے ۔"

۔ بنے ۔ میں نے کہا ۔ مجھے ہر ایک " ملک " پکارتا ہے "

سجاد ظہیر عرف بنے سے یہ میری پہلی ملاقات تھی بعد میں انھیں بنے بھائی پکارنے لگا میرا دل انکی طرف یوں بھی مائل تھا کہ میں ابھی تک یوپی کے کسی بھی بڑا اردو مصنف سے نہیں ملا تھا اگرچہ میں لاہور میں اقبال سے واقف تھا اور ویسٹ اینڈ لندن میں سر عبدالقادر کے مکان پر تاثیر اور دیگر کئی پنجابی مصنفین اردو سے مل چکا تھا ۔ لیکن پچھلے سال تو میں خاص طور پر یوپی جاکر پریم چند سے مل آیا تھا ۔

بہر حال میں سجاد ظہیر کے دل آویز انداز: اس کے جسم کی مدھم حرکات اور اس کے نرم چہرے سے مترشح بے ساختہ گرمجوشی سے بہت متاثر ہوا پھر اس بات نے بھی مجھے متاثر کیا کہ یہ نازونعم میں پلا ہوا آکسفورڈ کا طالب علم خاص طور پر سکلت والا کی تقریر سننے آیا تھا بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ہند کے بورژوا خاندانوں کے بہتیرے لڑکے آکسفورڈ یونیورسٹی کے اکتوبر کلب کے ممبر بن چکے تھے ۔ جہاں ایک بار مجھے بھی تقریر کرنے کیلئے بلایا گیا تھا

دوسری بار جب بنے سے ملاقات ہوئی تو وہ پیرس سے واپس آچکے تھے ۔ جہاں وہ سوربون یونیورسٹی میں چند دوستوں سے ملنے گئے تھے مجھے یاد ہے کہ بنے ، سی گھوش جو آکسفورڈ میں انگریزی ادب کے لکچرار تھے اور بنے دونوں ساتھ ہی ساتھ بلومس بری میں واقع میرے کمرے میں آئے اور یہ طے پایا کہ ہم مصنفوں کی انجمن جو بنانے والے تھے میں اس کیلئے ایک مینوفیسٹو تیار کروں بنے نے تاثیر سے بھی میرے یہاں آنے کو کہہ رکھا تھا اور تھوڑی دیر بعد کسی نے بڑے زور سے میرے دروازہ کو کھٹکھٹایا ۔ میں نے دروازہ کھولا تو لاہور کا یہ فربہ و بارعب ہموطن میرے کمرے میں داخل ہوا ۔

۔ اچھا تو یہ ہے بلومس بری ۔ تاثیر نے آتے کے ساتھ ہی کہا

بات یہ تھی کہ میرے کمرے میں کوئی پلنگ تو تھا ہی نہیں ۔ میں نے ہندوستانی طرز معاشرت کے مطابق بستر کو فرش پر لگا دیا تھا ۔ اور اسے پھلکاری کے ملنگ پوش سے ڈھک دیا تھا ۔ جب میں پچھلی بار ہند گیا تھا تو میری ماں نے اپنے مختصر اثاثے میں جسے اس نے سنبھال کر رکھا تھا مجھے یہ ملنگ پوش عنایت کیا

میں اپنے چھوٹے سے باورچی خانے میں چائے بنانے لگا ۔ غریبوں کے بارے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے اس خاص انداز کے مظاہرے سے مجھے پسینہ چھوٹنے لگا تھا ۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں گورنمنٹ کالج لاہور اور خالصہ کالج امرتسر کے درمیان ایک کرکٹ میچ دیکھنے گیا تھا میرے پاس کوئی پتلون نہیں تھا ۔ ماں نے میرے والد کے ایک پرانے پتلون کو کاٹ چھانٹ کر میرے سائز کا بنا دیا تھا ۔ اور میں یہ پتلون پہن کر شرم سے گڑا جا رہا تھا ۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے بیشتر لڑکے دولت مند اور خوشحال گھرانے کے

جیسے چیتھڑے ہوئے تھے لہٰذا وہ کالج کے بلیزر اور خاکی فلالین کی پینٹ پہنتے تھے جن کی سلائی مال روڈ کے رنگین اینڈ کو کے یہاں ہوتی تھی اور حسرت یہ حالانکہ اس عالیشان دوکان کو دیکھ کر ہی مجھ پر وہ رعب پڑتا تھا جس سے میں کبھی چھٹکارا نہ پا سکا۔ گورنمنٹ کالج کے متمول لڑکوں کے پاس موٹر سائیکلیں تھیں اور وہاں کے پروفیسر لے اس بجا سکا تو کیا کہنا وہ ایک نفیس سوٹ میں ملبوس، بوٹائی لگائے گھومتے تھے۔ امرتسر میں میرے گارجین پروفیسر کے، ابن عبا جیا نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ کبھی مصنف ہونا ہوا اب ہوا اور مجھ پر اس بات کا اثر پڑا تھا کہ میں نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب میں سبزی لینے نہیں جایا کروں گا پھر میں نے ضد کی حتیٰ کہ بڑے بھائی کا ایک پرانا بلیزر کاٹ کر میرے سائز کا بنا دیا جائے۔ پہلے میں کبھی کبھار اپنے رشتہ داروں کی دوکانوں پر خوش گپیوں کیلئے چلا جایا کرتا تھا لیکن وہ لوگ تانبے کے برتن بنایا کرتے تھے اس لئے میں نے ان کے یہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ اب میں سید حسین اور ترلوچن سنگھ کے ساتھ جو کالج میں مجھ سے سینیئر طلبا تھے، امرتسر ریلوے اسٹیشن کے بالمقابل اور انگلش اسٹائل کے فرسٹ کلاس ڈائننگ روم میں چائے پیتا تھا۔ مختصر میں سادے دھوتی بند لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اور میں نے اردو فارسی شاعری سے منہ موڑ کر ساری توجہ انگریزی ادب پر مرکوز کر دی تھی۔

لیکن ایک دن جب میری ماں بیمار پڑی اور اس نے مجھ سے ڈاکٹر بلانے کو کہا تو ایک دم میری نگاہ سے سارے پردے ہٹ گئے اور مجھے احساس ہوا کہ وہ چاہے کتنی بھی جاہل کیوں نہ ہوں بہرحال میری ماں ہے۔ ہم دونوں کو ایک ہی دھرتی نے جنم دیا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے ہندوستانی سے انگریز نہیں بنا سکتی۔ پھر جب میں انگلینڈ آیا تو مجھے اور میرے دو ہندوستانی ساتھیوں کو کئی انگریز طالب علموں نے خوب مارا کیونکہ ہم ہندوستانی انگریز کان کنوں کی ہڑتال کی موافقت کر رہے تھے جو کوک منے کرائی تھی اور انگریز طالب علم اس کے خلاف تھے۔ پھر میں نے یونیورسٹی کلب کے لندن کا بلیزر پہننا ترک کر دیا۔ کارڈورائے کا سوٹ سلوا لیا۔ اپنے بال لمبے چھوڑ دیئے۔ اپنا کھانا خود پکانے لگا۔ اور برطانوی ادبی رسالوں میں مضامین اور تبصرے لکھ کر روکھی سوکھی کھا کے گزارا کرنے لگا

تو پنے کا آکسفورڈ یونیورسٹی بلیزر مجھے برا نہیں لگا۔ کیونکہ وہ کثرت استعمال سے گھس چکا تھا لیکن تاثیر کا باندا سٹرائپ کا سیلا بھورا سوٹ اور فیشن ایبل جوتے مجھے کھل گئے۔ ڈاکٹر گھوش کا گنجا سر اور پرانا سوٹ بھی میرے مزاج کے مطابق تھا جب میں چائے دم دے رہا تھا تو تاثیر کی آواز گونجی

کیا کچھ کیک بھی ملے گا؟

۔ صرف خستہ بسکٹ۔ میں نے جواب دیا۔ اور ایک نہایت دلفریب لکڑی کے ٹرے میں جس پر چینی کام کی پالش تھی چائے کا سامان لے آیا۔ یہ ٹرے میں نے ڈرینی اسٹریٹ کی مفت دوکانوں سے پانچ شلنگ میں خریدا تھا۔

ماننا پڑے گا کہ اس کا ذوق صحیح ہے ڈاکٹر گھوش بولے۔ تمہیں یہ کانگڑہ نقاشی کی چھوٹی چھوٹی تصویریں کہاں سے مل گئیں

۔ بس مل گئیں۔ میں نے کہا مجھے سیر و شکار سے متعلق جو موٹی موٹی کتابیں تبصرے کیلئے ملتی ہیں میں انہیں بیچ دیتا ہوں اور قدیم نوادر کی دوکانوں سے ہندوستانی کاریگری کے بچے کھچے نمونے خرید لیتا ہوں۔ کیونکہ دراصل میں ہندوستان کی دریافت میں مشغول ہوں

۔ اور یہی ہمارے منصوبے کا مرکزی خیال ہوگا۔ ہند کی دریافت، ہندوستانی کلچر کی دریافت۔ سجاد ظہیر نے اپنی مدھم آواز اور نرم لہجے میں کہا۔

" بادیانت اصلاح اور تجدید ۔" میں نے کہا۔ " ابنیدر ناتھ ٹیگور کے شاگرد چغتائی کی طرح کا احیاء کافی نہیں ہم کو ادب اور مصوری دونوں میں احیاء پرستی سے بچنا چاہیئے ۔ ماضی مر چکا ہے ۔ اس بیمانۂ سرے سے جان ڈالنا عبث ہے ہمیں حال سے سروکار رہے اور اپنے زمانے کے مسائل حل کرنا ہیں "

" شاباش " ڈاکٹر گھوش نے کہا ۔ " میں تم سے بالکل متفق ہوں "

" آخر میرے دوست چغتائی میں کیا خرابی ہے ؟ " تاثیر نے پوچھا

" مجھے مصوری کا علم نہیں ہے لیکن وہ احیاء پرست ہے کہ نہیں ؟ " بنے نے کہا

ڈاکٹر گھوش نے احیاء پرست مصوروں کی " لمبی لمبی انگلیوں اور بادام جیسی آنکھوں " کا مذاق اڑانا شروع کر دیا ۔ میں نے اسکی حمایت میں اپنا نظریہ پیش کیا کہ انیسویں صدی کے آخری دہے اور پہلی جنگ عظیم سے قبل بنگالی فن کاروں کو انگریز مصوری کے ماقبل رفائیل گروپ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ۔ تاثیر چغتائی کی مدافعت میں دکھائی دیتا ۔ بحث بے طول پکڑا رنگ چاہئے کو گویا بھول گئے خستہ بسکٹ کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا شام کے نرم دھندلکے کے باوجود کمرے میں تناؤ کی فضا تھی ۔ صرف بنے آہستہ آہستہ چائے کی چسکی لگاتے رہے

" مینی فیسٹو کے بارے میں کیا خیال ہے ! " بنے نے موقع پاکر پوچھا

" تین آدمی مل کر کوئی چیز نہیں لکھ سکتے ہم میں سے ایک کو یہ مسودہ تیار کرنا ہوگا

تاثیر کو پہلا مسودہ تیار کرنے دو " میں نے کہا

" ارے تم خاصے سمجھدار نکلے " تاثیر نے کہا

" یار میں اتنا گھامڑ نہیں جتنا کہ صورت سے لگتا ہوں " میں نے کہا اور اس پر ایک قہقہہ پڑا

" پہلا مسودہ ڈاکٹر گھوش کو تیار کرنے دو ۔ " بنے نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے اور سب اس پر راضی ہو گئے

" ڈاکٹر گھوش نے کوئی ایک مہینہ میں مسودہ تیار کر لیا اس سے کام تو نکل سکتا تھا لیکن اسمیں کوئی گہرائی نہیں تھی پھر بھی ہوا یوں کہ اس مسودہ پہ بحث کے دوران ہم سبھوں کی گویا کایا ہی پلٹ گئی اور اختلاف رائے کے باوجود ہماری دوستی میں پختگی آتی گئی

پھر یہ بھی ہوا کہ اب کا مفہوم سمجھنے کے عمل میں ہم ادب کو اپنے عوام سے محبت پر مبنی کرنے لگے ، معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہماری روح میں ایک تبدیلی آ گئی ۔ ہم نے اپنے ، بورژوائی چھوٹے بورژوائی اور جاگیر دارانہ نقطۂ نظر کو ترک کر کے یہ تسلیم کر لیا کہ اپنی ساری خامیوں ، کمزوریوں اور نقائص کے باوجود ہندوستانی بہرحال انسان ہیں ہمیں احساس ہونے لگا کہ بدیسی حاکموں نے ہماری دولتوں کو نظر انداز کر کے اور ہماری کلچر کو کچل کر ہمارے پرکھوں کو اپنے ساتھ ملانے کیلئے ان میں امارت و دولت پرستی اور انسانیت کش اقدار پھیلائی تھیں سامراجیوں نے پہلے تو عوام کو جاہل رکھا ہر صورت سے ان کا استحصال کیا اور انھیں ذلیل کیا پھر وہ کہنے لگے کہ ہندوستانی جاہل اور گندے ہیں اور انسان کہلانے کے مستحق نہیں

پھر ہمیں یہ احساس ہوا کہ اس سلسلے میں خود ہماری کوششیں بھی رومانی اداؤں سے زیادہ نہ تھیں کیونکہ ہم میں سے فقط کو اپنے عوام کے مصائب کا کوئی واقعی تجربہ تھا ۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری تھا کہ ہم اپنے الفاظ کو عمل میں منتقل کریں یہ الفاظ دیگر جب تک ہم اپنے عقائد پہ عمل کر کے نہ دکھائیں ۔ ہم آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کے حقدار نہیں بن سکتے اس سلسلے میں ہمیں اپنی بہت سی خامیوں سے

سے کا ساتھ دیا اور انہیں دور کرنا ضروری تھا

جہاں تک میرا تعلق ہے میں اوّل ایک غریب متوسط گھرانے میں پیدا ہوا تھا جب میں گاندھی جی کی تحریک میں شامل ہو کر جیل چلا گیا تھا تو میرے والد نے میری ماں کو زدوکوب کیا تھا۔ جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں ماں کی مدد سے گھر سے بھاگ نکلا اور ڈاکٹر اقبال کی مدد سے فلسفہ میں تحقیقات کرنے لگا۔ پھر جب میرا ضمیر مجھے بار بار ستانے لگا کہ میں ایک مفصل اقبال نامہ لکھوں تو میں جلا وطنی ترک کر کے وطن واپس آیا لیکن مجھے ضروری معلوم ہوا کہ میں گھر جانے کی بجائے احمد آباد میں مہاتما گاندھی کے آشرم میں داخل ہو جاؤں تاکہ تحریک آزادی کے بارے میں اپنے احساسات کو شدید تر بنا سکوں اور اپنے عہد کو پورا کرنے کیلئے ٹیٹیاں صاف کر سکوں تب کہیں جا کر میں نے اپنے پہلے ناول اچھوت کو از سر نو لکھنا شروع کیا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں اپنی نرگسیت سے بڑی حد تک چھٹکارا پا چکا تھا لہٰذا میں اس مینو فیسٹو کو زیادہ براہ راست طور پر لکھ سکتا تھا

ڈاکٹر گھوش کے مسودے میں بس ایک چیز کی کمی تھی جو تمام از خود جلا وطن کردہ دانشوروں میں پائی جاتی ہے یعنی انہیں اپنے ملک کے عوام کا کوئی حقیقی تجربہ نہیں تھا۔ آزادی کا نظریاتی تصور تو موجود تھا لیکن اس کا انہیں مطلق علم نہیں تھا کہ ہندوستان میں ایک عمر پر جیسے اسکول تک جانے کا موقع نہیں ملتا۔ کیا حقیقت ہے اگر میں نے سجاد ظہیر کو صحیح طور پر سمجھا تو ان کا مقصد یہی تھا کہ ان سب لوگوں میں جنہوں نے کبھی قلم ہاتھ نہیں پکڑا ایک نئی بیداری اور شعور پیدا کیا جائے

تاثیر بھی نچلے متوسط طبقے سے حیرت انگیز طور پر ابھر سکے۔ لیکن وہ اس طبقے کی خامیوں پر نظمیں لکھا کرتے تھے علاوہ ازیں وہ ادیب ہیں۔ آئی اے رچرڈس کولرج اور ایلیٹ وغیرہ سے متاثر اور ان تنقیدی نظریوں کے داعی تھے۔ اور اسی اساس پر اپنے ملک کے ادب کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ وہ محمد اقبال کو بالکل فراموش کر چکے تھے۔ اگرچہ جیوتی اودھ ہائی کورٹ کے سابق لارڈ چیف جسٹس کے بیٹے تھے لیکن خیالات و تصورات میں دوسروں کی بہ نسبت ذہنی مجھ سے قریب تر ہی تھے۔ جب وہ آکسفورڈ اکتوبر کلب کے ممبر تھے تو گویا ان میں اتنی ذہنی تبدیلی ہو چکی تھی کہ انھوں نے آبائی اعلیٰ طبقہ سے اپنا ناتا توڑ کر عوام سے اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا۔

مزید برآں وہ اودھ کے نچلے متوسط طبقے کے ذی شعور لوگوں کے بہت قریب رہ چکے تھے اور انہیں اس مہذب اور انحطاط پذیر طبقے کے دکھ درد کا سچا احساس تھا جسے وہ عرصہ سے جھیلتا آ رہا تھا۔

سجو نے بتایا کہ انکی ماں بھی جونپور کے ایک دیہات کی رہنے والی تھیں اور ممکن ہے عوام کی محبت کا یہ جذبہ بیٹے کو انہیں سے ملا ہو اسی لئے کیونکہ وہ اپنے دوستوں کی خامیوں کا مذاق نہیں اڑا سکتے تھے لیکن انکی حالت پر ایک پاکیزہ غصہ آتا تھا جو ہماری اس تحریک کے بنیادی جذبے کے بھی بہت قریب تھا جو ہم ایک جان ہو کر دلوں کو بدلنے کیلئے چلانے والے تھے

سجو سے بھی بات چیت کے دوران میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی ان میں قلب ماہیت کا عمل مکمل نہیں ہو پایا تھا اگرچہ گھوش یا تاثیر کی بہ نسبت ان میں تبدیلی زیادہ آ چکی تھی چونکہ اپنے ان دوستوں کی بہ نسبت سجو مجھے اپنے دلی جذبات زیادہ مکمل طور پر ظاہر کرتے تھے لہٰذا مجھے انکی مشکلوں سے بھی ہمدردی تھی۔

میں خود اس موقف میں نہیں تھا کہ کسی جانب سے کوئی سرپرستانہ رویہ اختیار کروں، لہٰذا میں سجو کی کمزوریوں کو درگزر کرتا رہتا تھا۔ مثلاً ملاقات کا وقت مقرر کرنے کے بعد بھی وہ تاخیر سے آتے تھے۔ اوّل تو وہ ایک بڑے گھرانے میں رہنے کے عادی تھی پھر یورپ کا لج کے ماحول نے بھی انکی عادات و ترجیحات میں کوئی فرق نہیں ڈالا تھا

مثلاً وہ ہر روز دوپہر کے کھانے کے بعد تین گھنٹے قیلولہ کرتے تھے اور یہ عادت اس وقت تک نہ چھوٹی جب تک کہ انھیں ہند کی جنگ آزادی کی شدید جدوجہد کا سامنا نہ کرنا پڑا . . . . اور تب جاکر انھوں نے نہ صرف دو سروں کو بلکہ خود کو بھی صحیح طور پر پہچانا۔ بنّے نے بتایا کہ چند سال قبل انھیں ایک شفاخانہ میں داخل ہونا پڑا تھا اور ڈاکٹروں نے صلاح دی تھی کہ وہ دوپہر کو بلاناغہ قیلولہ ضرور کریں۔ وہ شاید موت کی سرحدوں کو چھو آئے تھے۔ اور اب وہ موت کے احساس کو کبھی بھلا نہ سکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ انھیں یہ دریافت کرنے میں ایک عرصہ لگے گا کہ خوف، تنہائی اور شخصیت کے احساس کو ہمیشہ الفاظ اور عمل میں یا بہ الفاظ دیگر تخلیقی عمل میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

ہر حال میں نے انکی ساری نرگسی علامتوں کو قبول کرلیا البتہ ایک پنجابی انداز سے ان کا مذاق بھی اڑاتا رہا۔ اور ان کے سارے رشتہ داروں اور ساتھیوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا

بہرحال قابل لحاظ بات یہ ہے کہ وہ اپنی عمر کے چوتھے دہے میں داخل ہو چکے تھے اور انھوں نے نہ صرف تخلیقی بلکہ عوامی تحریک کا کام بھی شروع کر دیا تھا اور بنّے کی مساعی کے باعث بہت سے ہندوستانی طالب علموں اور مصنفوں نے اپنے جاگیردارانہ خیالات اور عادتیں ترک کر دی تھیں اور ان کے دل اور دماغ میں دور مساوات کے نقیب تیر ان کی اہمیت کا زیادہ بہتر احساس پیدا ہو چلا تھا

شاید بنّے اپنے ہم عصروں سے گہرا تعلق پیدا کرنے میں اس لئے بھی کامیاب ہو گئے کیونکہ اس وقت تک آکسفورڈ اور کیمبرج میں ہندوستانی طالب علموں کی حیثیت عیاں ہے وہ کتنے ہی امیر گھرانے کے کیوں نہ ہوں محض نوآبادی یا سشند وں کی تھی ممکن ہے کہ بعض طالب علموں نے ہند میں کوئی ذلت نہ اٹھائی ہو کیونکہ وہاں تو ان کے والدین بدیسی حاکموں کے معاونت کار تھے لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج میں تو برطانیہ کے اعلیٰ طبقہ کے اور قدامت پسند طلبا کا احساس برتری پر مبنی رویہ، نسلی مغایرت کے احساسات کی ساری پرتوں کو واضح کر دیتا جو برطانیہ کے طبقاتی معاشرے میں جبلی طور پر موجود ہیں۔ میں بذات خود تین چار نسلوں سے واقف ہوں جن میں کوئی بھی ایسا ہندوستانی طالب علم آکسفورڈ اور کیمبرج میں نہیں تھا جو کم از کم برطانیہ میں اپنے قیام کے دوران قوم پرست نہ بن گیا ہو۔ اُن دنوں فاشسٹ نے فروغ پایا تھا اور اس نے جو مظالم ڈھائے اور ادھر سامراجیوں نے جس طرح ہماری جمہوری ریاستوں کے ساتھ غداری کی اور دوسری جنگ عظیم کے لمحہ تک جس طور پر ایشیا اور افریقہ میں اپنا تسلط جمائے رکھا۔ اس سے بہتوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ہمارے دشمنوں کی یعنی ہمارے عزائم اور انکی تکمیل کے دشمنوں کی صحیح صورت گویا ایک آئینے میں منعکس ہو کر ہمارے سامنے آگئی

انجمن ترقی پسند مصنفین کا مینی فیسٹو ہماری ایک ماہانہ میٹنگ میں منظور ہوا جو لندن میں چیرنگ کراس روڈ سے متصل نان کنگ ریسٹوران کے زیریں کمرے میں منعقد ہوئی۔

یہ منشور جس کی ہم قسم کھاتے تھے اس لئے نہیں اہم تھا کہ اس میں ہندوستان کی ثقافتی صورت حال کا کوئی مکمل تجزیہ، تعریف یا وضاحت تھی مینو فیسٹو اس لئے اہم تھا کہ ہم نے صدیوں کی مقدر پرستی ترک کر کے جاگیرداری اور تنزل سے منہ موڑ کر اپنا جون بدل لی تھی اور اب ہم حال اور اسکی آزادی پر عقیدہ رکھتے تھے ہم چند مشترک اقدار کی بنا پر مختلف الخیال مصنفوں کے درمیان قرب باہم اور اتحاد کے جذبات کو قوی کرنا اور فروغ دینا چاہتے تھے۔

اور اگرچہ ہم میں چند لوگ سر بری کی کوٹھریوں میں رہتے تھے۔ لیکن ہم نے منشور کے ذریعہ اس ضرورت کا بھی اعلان کیا کہ ہمیں برطانیہ چھوڑ کر ہندواپس جانا چاہیے اور وہاں عوام کی زندگی میں شریک ہو کر ایک ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیے

جن کے کردار خیالی نہیں بلکہ گوشت پوست کے بنے ہوں، جو اپنے آپ سے بخوبی آگاہ ہوں اور اپنے گرد و پیش کے انسانی حالات کے مطابق عمل کرتا ہوں — ۱

ہم نے فسطائیت کے خلاف سیاسی جدوجہد میں جو حصہ لیا اس سے ہمارے جذبات مشتعل ہو چکے تھے لیکن ابھی ہمارے ساتھ کچھ دلوں پر کچھ ایسے اثرات باقی تھے (مثلاً جیمز جوائیس نے اپنی زیرِ تصنیف کتاب میں جو زبان الٹ پلٹ استعمال کی تھی جس کا تدارک ضروری تھا) اس کا علاج یہ تھا کہ ہم سب اپنی مادری زبان میں لکھنے لگیں اور عوام کی بول چال کی زبان استعمال کریں۔

ترقی پسند مصنفین کے مینی فیسٹو کے کئی حصوں و مراتب پر سجاد ظہیر اور میں ان دنوں بھی بحثیں کرتے تھے۔

ایک موضوع تو یہ تھا کہ "خود مطلب" کتنا ضروری ہے اور یہ طے کرنا ضروری تھا۔ کلاسیکی ادب سے جو ہم وابستگی رکھتے ہیں وہ تکنیک کے لحاظ سے اور کہاں تک کس طور پر۔ میں نے سجاد سے کہا اول تو ہمیں اپنے ثقافتی ورثے کی دوبارہ تعریف کرنی چاہیئے اور پھر یہ اعلان کرنا چاہیئے کہ ہم اس سے صرف وہی چیزیں لیں گے جو ہمارے موجودہ زمانے کے حالات سے نسبت رکھتی ہیں اور باقی چیزوں کو طاق پر رکھ دیں گے۔

پھر ہم اس پر بھی بحث کرتے کہ ہمارا ادب موجودہ بورژوا اور جاگیردارانہ ادب سے کس طرح سے مختلف ہوگا۔ کیا ہم حالات کو منظر عام پر لاکر اور محض ان کا بیان کر کے اپنی لاطبقیت کا اظہار کریں گے جب کہ ضرورت اس کی ہے کہ ہم توہم پرست عوام کو عقل پرست بنانے اور مردہ عادتوں کی جگہ پر تجدید کی نئی روشنی لانے کا ایک ولولہ پیدا کرنے کے لئے طنز کا بھرپور وار کریں، مزید یہ کہ ہمیں مردوں عورتوں کی وہ بڑی تعداد کہاں سے آئے گی جو ترقی یافتہ ادب کی تخلیق کے ذریعے ہمارے ستم زدہ عوام کی آگاہی کی سطح کو اونچا کر سکے۔ آخر یہ لوگ ملیں گے کہاں سے۔ پھر ہم نے طے کیا کہ ان بہت سے بیشتر سوالوں کا جواب ہندوستان ہی دے گا چنانچہ سجاد ظہیر نے فیصلہ کیا کہ وہ جلد ہی بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وطن واپس چلے جائیں گے اور وہاں وہ کل ہند ترقی پسند مصنفین کا ایک کنونشن منعقد کریں گے۔ میں ان کے جانے کے تھوڑے دن بعد آجاؤں گا"

مجھے یاد ہے کہ اس فیصلے کے بعد سجاد ظہیر نے قانون کی پڑھائی میں اپنے کو غرق کر دیا۔ انکی کاہلی ہوا ہو گئی وہ ملاقات کے اوقات کی پابندی کرنے لگے اور انکی قوتِ گویائی میں اضافہ ہو گیا۔ جب ہم پہلی بار ملے تھے تو وہ رک رک کر، ہچکچاہٹ کے ساتھ اور جھینپ جھینپ کر تقریر کرتے تھے! ...... اور اب وہ ایک بڑے بڑے مجموعوں کے سامنے خاصی وضاحت اور روانی سے تقریر کرنے لگے ———

اس میں کوئی شک نہیں کہ مینی فیسٹو نے کم از کم سجاد ظہیر میں ایک انقلابی تبدیلی کا آغاز کر دیا تھا۔

تھوڑے دنوں بعد ہی وہ ہندوستان واپس چلے گئے

... ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ سجاد ظہیر نے کانفرنس کے دوران مجھے خط لکھا کہ کانفرنس کا بہت پرجوش خیر مقدم ہوا ہے اور نوجوان ذی شعوروں کی بھاری اکثریت نے اس کے اعلان نامے پر دستخط کر دیئے ہیں

اور میں جلد ہی ان لوگوں سے آن ملا سجاد جعفری، سبط حسن۔ احتشام حسین۔ فراق گورکھپوری۔ احمد علی، عبدالعلیم سمترانندن پنت، پی سی گپتا، امرت رائے، ہیرن مکرجی، اشوز دے مکرجی وغیرہ ان سب کو سجاد ظہیر اس تحریک میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تک کوئی ایک سال تک سجاد ظہیر کے ساتھ وزیر منزل، شاہ گنج لکھنؤ میں ظہیر خاندان کے مہمان کے طور پر مقیم رہا یہ دور تک پھیلا ہوا ایک بڑا مکان تھا۔ بنّے اور میں ملک کے ہر گوشے میں دوروں پر جایا کرتے تھے اور پنڈت جی کیلئے مختلف موضوعات پر نوٹ تیار کیا کرتے تھے مجھے پتہ چلا کہ بنّے اپنے گھرانے میں بڑے ہر دلعزیز ہیں چونکہ انھوں نے اپنی زندگی ایک مقصد کیلئے وقف کر دی تھی لہذا ہر ایک ان سے متاثر تھا۔ ان کے والد سر وزیر حسن نے لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ انھیں سر وزیر حسن کی جگہ شہید حسن کہا جائے ان کی والدہ جنھیں لوگ پیار سے "بوّا" کہتے تھے ان کی شادی کے بارے میں فکر مند تھیں تاکہ ان کے بچے بھی انھیں کی طرح ہوں۔ ان کے بھائی سیاسی معاملات میں ان سے اختلاف رائے رکھنے کے باوجود ان کی عزت کرتے تھے اور جب بھی وہ اپنے دوروں سے واپس آتے اُن کی بھابیاں اُن کے لئے طرح طرح کے کھانے پکا کر خوش ہوتیں۔

میرا کمرہ وزیر منزل کے اس حصے میں تھا جس میں پروفیسر حسین ظہیر جنھیں پیار سے "منے" پکارا جاتا تھا اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے ان کی بیوی کا نام "سیدہ" ہے کسی لحاظ سے "منے" "بنے" کے قریب ترین تھے کیونکہ وہ بھی ایک فعال شخص ہیں دوسری طرف ایک ماہر کانگریسی اور لکھنؤ یونیورسٹی میں کیمسٹری کے پروفیسر تھے بلکہ ادب اور فنون لطیفہ میں بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

کھانے کا کمرہ مشترک تھا۔ لہذا ہم سب کھانے کے وقت ایک ہی میز پر جمع ہو جاتے۔ لہذا بنّے کے صدر میں بھی جیسی اس طرح میں رفتہ رفتہ لکھنؤ کی تہذیب سے خاصا واقف ہو گیا۔ کیونکہ میں اس گھرانے کے مختلف لوگوں سے مرد دن تین بار یعنی کھانے کے اوقات پر تو ضرور ملتا تھا۔ اور بعض بعض خاص موقعوں پر "بنّے" کی بہنیں بھی اپنے بچوں سمیت آ جاتی تھیں اور اس طرح میری واقفیت بڑھتی ہی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ عید کے موقع پر کنبے کے کوئی پچاس آدمی اپنے والدین کو عید کی مبارکباد دینے اکٹھا ہو گئے تھے۔

ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس ۱۹۳۸ء میں منعقد ہوئی اور ہم نے رابندر ناتھ ٹیگور کو اسکی صدارت کرنے پر راضی کر لیا۔ پھر سجاد اور میں سارے ہند میں اپنی تحریک کو فروغ دینے کے لئے اور تقریباً ساری بڑی زبانوں کے مصنفوں نے ہماری تحریک کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔

اگلے دس برسوں کے دوران، چاہے وہ جیل میں ہوں یا باہر سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کا محور بنے رہے میں ۱۹۳۹ء کے اوائل میں تھوڑے عرصہ کیلئے انگلینڈ واپس چلا گیا تھا اور وہاں جا کر پھنس گیا تھا۔ کیونکہ میری توقعات کے ایک سال بعد جنگ عظیم چھڑ گئی نتیجاً میرے اور سجاد ظہیر کے درمیان سات سال تک کوئی رابطہ قائم نہ رہ سکا۔

اس سے قبل جنگ آزادی کی جدوجہد زور پکڑ چکی تھی۔ جس کے باعث ہم جواہر لال کے بہت قریب آ گئے تھے۔ سجاد ظہیر نے الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں جواہر لال کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا اور پنڈت جی انھیں بہت چاہنے لگے تھے۔ سجاد ظہیر بنّے اور جواہر لال دونوں ایک ہی جیل میں بھی ساتھ ساتھ رہے اور بنّے نے مجھے ایک خط میں بتایا کہ نہرو لوگ انکے نئے خیالات کو فروغ دینے میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہمارا ایک دوسرا ساتھی جو جیل میں ان دونوں کے ساتھ تھا۔ کالا کانکر کا لنور برجیش سنگھ تھا۔
میں نے انگلینڈ میں پہلے تین سال قیام کے دوران اپنا ناول "ننگا" اور "جنگ" مکمل کر لیا۔ جو دراصل

میرے سلسلہ وار ناولوں کی تیسری اور آخری قسط تھی ۔ اس ناول کا محل وقوع کالاکانکر تھا اور اس میں اودھ کے تعلقہ داروں کے خلاف کسانوں کی بے ساختہ گو ناکام جد و جہد کا ذکر تھا ۔ میں نے یہ ناول سجاد ظہیر کے نام معنون کیا ہے ۔ کیونکہ ناول کا پہلا مسودہ اسی دوران لکھا گیا تھا جب کہ میں دارجیلنگ کالاکانکر اور لاہور میں سجاد ظہیر کے ساتھ تھا میں نے اس انتساب کے ذریعہ سجاد ظہیر اور ان کے گھر والوں کو جنہوں نے اپنی محبت، مہمان نوازی اور تشویق سے مجھے نوازا ہے، خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔

جنگ کے بعد ایک بار پھر بمبئی میں ہمارا ساتھ ہوا ۔ یہ ایک آزمائشی دور تھا ۔ ہمیں معلوم تھا کہ انگریز کو ہندوستان چھوڑنا پڑے گا لیکن وہ جاتے جاتے ہند کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کر کے جائے گا

امید افزا بات یہ تھی کہ سجاد ظہیر اردو کے دانشوروں کو فرقہ واری کے خلاف متحد کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے ۔

ہر ہفتہ بمبئی میں اوپیرا ہاؤس کے قریب دیودھر ہال میں ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوتے اور شاعروں اور افسانہ نگاروں کی ایک نئی پود اپنا کلام سناتی اس میں کیفی اعظمی اور راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، مجروح سلطانپوری اور شیلندر بھی شامل تھے ان سے قدیم تر لکھنے والے کرشن چندر، جعفری اور خواجہ احمد عباس بھی پختگی کے ساتھ لکھ رہے تھے

۱۹۴۷ء میں ہندوستان و پاکستان کے بٹوارے سے ہم کو ایک اندھے کنوئیں میں جھونک دیا گیا ہم کو خونریزی اور عزیز دوستوں مثلاً فیض احمد فیض سے جدائی پر صبر کرنا پڑا ۔

اور تب سجاد ظہیر نے فیصلہ کیا کہ وہ جلد از جلد پاکستان جائیں گے تاکہ وہاں کے پرانے مجاہدین آزادی میں خیر سگالی پیدا ہو سکے اور وہاں سے نئے ذی شعور لوگوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے مشترک مقصد یعنی غذائے جسمانی و روحانی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کریں گے ۔

ہم نے سجاد ظہیر کو سانتا کروز کے ہوائی اڈہ پر خیرباد کہا جو اس وقت ایک چھوٹا سا ہوائی اڈہ تھا ہم جانتے تھے کہ کراچی پہونچتے انہیں روپوش ہو جانا پڑے گا کیونکہ جن با اقتدار لوگوں کے ہاتھ میں اس نئے ملک کی حکومت کی باگ تھی وہ زمیندار اور رجعت پسندوں کے قدیم مفاد پرست طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ۔

اور ہوا بھی ایسا ہی ۔ سجاد ظہیر کو بیشتر اوقات روپوشی میں رہنا اور کام کرنا پڑا لیکن وہ ایک ہراول دستہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ چند ہی دنوں بعد ان پر فیض احمد فیض اور چند دیگر لوگوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ پاکستان کی جائز حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہے تھے انہیں بلوچستان کی ایک جیل میں رکھا گیا اور ان کا مقدمہ کئی سال تک چلتا رہا کئی حلقوں نے سفارش کی کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں اور بالآخر کئی سال تک عالمی رائے عامہ سے مجبور ہو کر حکومت نے انہیں رہا کیا

جواہر لال نہرو نے جو سجاد ظہیر سے بڑی محبت کرتے تھے بذات خود حکومت پاکستان کو اس پر راضی کر لیا کہ انہیں ہندوستان واپس بھیج دیا جائے

رشتۂ لوح و قلم

بنے بھائی کے نام

جسم کا ساز اگر ٹوٹ بھی جائے اے دوست
روح کا راگ نہیں مر سکتا
پا بہ زنجیر نہیں ہوتی بہاروں کی مہک
لالہ و گل کی ہنسی قید نہیں ہو سکتی
وقت صیاد تو ہو سکتا ہے
زندگی صید نہیں ہو سکتی

اے مرے مونس و ہمدم! مرے ہم راز و ندیم
آسماں کیوں کرے جھک جھک کے سلام
کہ بہت اونچا ہے اس سحری عظمت کا مقام
گردشِ وقت کے گنبد میں ہے لرزاں اب تک
تیری آواز کا جادو، ترے لہجے کا فسوں
اور نکھرا ہے ترے بعد ترا رنگ جنوں
تیرے خوابوں کے شفق زاروں کو
میرے تخیل کے سیاروں کو
تیرگی شب کی نگل سکتی نہیں

زندگی! تیرے لہو نے ہے نکھارا جس کو
پھر ظلمات میں غرقاب نہیں ہو سکتی
تیری تنویر دھندلکوں میں نہیں کھو سکتی
تیری تخلیق کی عظمت کا ہمہ گیر طلسم
حسن اور عشق کا وہ قصۂ پارینہ ہے
جس کو دہرائے گی تاریخ وفا صدیوں تک
اہلِ فن کیوں نہ کریں عظمتِ فن کی تکریم
رشتۂ لوح و قلم، رشتۂ جاں سے ہے عظیم
تو نہیں پھر بھی تری یاد کے ہر گلشن میں
تیری خوشبو سے معطر ہے بہاروں کا دماغ
تیرہ و تار فضاؤں میں ہیں روشن اب تک
تیری شہرت، تیری عظمت کے دل آویز چراغ
تیری تخلیق کے ہر نور بھرے جلوے سے
زندگی آج بھی تابندہ و رخشندہ ہے
رشتۂ لوح و قلم زندہ و پائندہ ہے

— پریم وار برٹنی

اویس احمد دوراں

سید سجاد ظہیر
اور اُن کے نظریۂ حیات کے بارے میں

سنہ ۱۹۷۲ء کے نشانِ خاص (رنگ) میں میرا ایک مضمون بعنوان "کیا سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند ادب ختم ہوگیا؟" شائع ہوا۔ اس اشاعت کے فوراً بعد مجھے سید سجاد ظہیر کا مبارکبادی کا خط ملا۔ جس میں انھوں نے دیگر باتوں کے علاوہ لکھا کہ آج صبح ناشتہ کی میز پر رضیہ نے تمہارا مضمون جو "نشانِ خاص" میں شائع ہوا ہے لاکر دکھایا۔ مضمون پڑھ کر مسرت ہوئی۔ تم نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ترقی پسند ادب کی تخلیق ہنوز جاری ہے۔ ہندوستان کے وہ خطے جہاں مزدور طبقہ کی تحریک طاقت ور ہے وہاں ترقی پسند ادب اب بھی زندہ ہے۔ جدیدیت پسندی ترقی پسند ادبی تحریک کو اس لئے نہیں مٹا سکتی کہ ہندوستان میں بائیں بازو کی جمہوری قوتیں روز بروز زور پکڑ رہی ہیں۔ ترقی پسند ادبی تحریک کا چونکہ ان قوتوں سے نہایت گہرا اور مستحکم باہمی رشتہ ہے اس لئے یہ تحریک اور اسکی تحت کی جانے والی ترقی پسند ادبی تخلیق اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہندوستان میں بائیں بازو کی جمہوری طاقتیں رواں دواں ہیں۔ جدیدیت پسندی چونکہ زندگی اور اس کے ادب کا منفی رویہ پیش کرتی ہے۔ اس لئے وہ اتنا دم خم نہیں رکھتی کہ ترقی پسند ادب کو ختم کر ڈالے۔ ہندوستان کا مزدور طبقہ تیزی سے بیدار ہوتا جارہا ہے۔ یہاں کے محنت کش عوام طبقاتی شعور سے لیس ہو رہے ہیں طبقاتی جدوجہد کی دھار بھی تیز ہوتی جارہی ہے اس لئے ان تمام عوامل اور محرکات کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ ترقی پسند ادب کا وجود برقرار نہ رہے۔ صفحۂ ہستی پر جب تک ترقی پسند اور باشعور طبقہ برقرار رہے گا اس وقت تک ترقی پسند ادب بھی اپنی تمام تر صحت مندیوں اور توانائیوں کے ساتھ باقی رہے گا۔ سجاد ظہیر نے یہ خط اس وقت لکھا تھا جب وہ ترکمانیہ (سوویت یونین کا ایک ایشیائی خطہ) کے لئے رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ مگر کون جانتا تھا کہ اس پیاری اور نہایت بیدار و تابناک ہستی کا یہ آخری سفر ہوگا اور اسکی پاکیزہ روح عشق آباد میں پرواز کرجائیگی اور ہم اپنے اس ممتاز نور اور قافلہ سالار کے بغیر منزلِ نجات کی تلاش میں گامزن ہونے پر مجبور رہوں گے؟ مگر ہمیں ایسا کرنا پڑا اس لئے کہ یہ اسکی ہدایت تھی۔

میں نے سطور بالا میں سجاد ظہیر کے خط کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اگر وہ خط میرے پاس محفوظ ہوتا تو میں اسے ہی نقل کر دیتا۔ سجاد ظہیر نہ صرف ایک عظیم دانشور اور اشتراکی ادیب تھے بلکہ وہ ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کے سب سے بڑے اور اول معمار تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں اشتراکی خیالات کی ترویج و اشاعت کے کام میں نہایت قابل

پیارا، وجیہہ و شکیل اور خوبصورت ہونے کی وجہ سے وہ مردوں کے لئے اتنے پرکشش تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ ان کے خد و خال میں چھپی جاذبیت اور مقناطیسیت لوگوں کو چشم زدن میں اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ جتنی دلآویز، جمال آگیں اور ریشم کی طرح ملائم انکی صورت تھی ویسا ہی ان کا دل بھی تھا۔ اتنا پیارا اور دل موہ لینے والا اشتراکی ادیب اور دانشور ہندوستان میں اب تک پیدا نہیں ہوا۔

سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور میجر جنرل اکبر خاں کو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے راولپنڈی سازش کے مقدمہ میں طویل عرصہ کے لئے جیل میں ڈال دیا تھا۔ ان بے قصوروں پر الزام یہ تھا کہ وہ پاکستان کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ جو بالکل من گھڑت اور بے بنیاد تھا!

سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور میجر جنرل اکبر خاں کو پاکستان اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں

وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

(یہ شعر جس غزل کا ہے وہ جیل کی تخلیق ہے)

مگر چونکہ سجاد ظہیر پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے اور پاکستان امریکی فوجی بلاک کا سرگرم ممبر تھا اور ہے اس لئے وہ امریکہ کا چہیتا تھا۔ اس زمانہ میں امریکہ ایڑی چوٹی کا زور اس کوشش پر صرف کر رہا تھا کہ ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ اور یوروپی ملکوں سے اشتراکی اثرات کے نام و نشان جس میں اسکو بری طرح منھ کی کھانی پڑی۔ لیکن پاکستان کو سوشلزم کے اثر سے بچائے رکھنے کے لئے راولپنڈی سازش نام کا ایک جھوٹا اور بے بنیاد افسانہ مرتب کرا لیا گیا جس کے نتیجہ میں سجاد ظہیر، فیض احمد فیض گرفتار کر کے آٹھ برسوں تک جیل میں ڈال دیئے گئے!

میں اس زمانہ میں نوعمر تھا سیاسی یا طبقاتی شعور نام کی کوئی چیز میرے اندر نہیں تھی۔ لیکن شعر گوئی کی ابتدا اس لئے اردو، ہندی اور بنگلہ کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں سے ملنا جلنا شروع ہو چکا تھا۔ بہار و بنگال کے ترقی پسند کے رہنما پرویز شاہدی تھے، اردو، ہندی اور بنگلہ زبانوں کے شعراء پرویز شاعری سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ کلکتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ نشستیں ہوا کرتی تھیں جن میں تمام ترقی پسند فنکار اپنی اپنی تخلیقات سناتے تھے ان پر تنقید بھی ہوتی تھیں میرے بڑے محترم احسان دربھنگوی جو ایک باصلاحیت غزل گو شاعر ہیں اس وقت ترقی پسند فنکاروں میں تھے اور کافی پکے ہوئے تھے۔ وہ اب بھی ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامل ہیں مگر پہلے کی طرح سرگرم نہیں۔ اس وقت مغربی بنگال کمیونسٹوں کا قلعہ تصور کیا جاتا تھا۔ تلنگانہ کے کسانوں کی تحریک کا زبردست اثر بنگال کے محنت کش عوام بالخصوص سیاسی رہنماؤں، فنکاروں اور دانشوروں پر پڑ چکا تھا۔ تلنگانہ کے سلسلہ میں کرشن چندر کے افسانوں اور مخدوم محی الدین کے نام کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اردو کے وہ شعرا جو گل و بلبل کی شاعری کرتے تھے خود کو عوامی لہروں سے ملا کر ترقی پسندانہ رنگ و آہنگ میں غزلیں کہنے کی سعی کرتے تھے۔ بنگال کا ذرہ ذرہ ترقی پسندوں سے متاثر نظر آتا تھا جو نہیں تھا اسکو بھی اس تحریک سے ہمدردی تھی۔ استحصال کاروں کے سوا کسی کو اس سے نفرت نہیں تھی۔ اسی دور میں پٹنہ سے سہیل عظیم آبادی کی ادارت اور استاذ کا نگریسی نیتا عبدالقیوم انصاری مرحوم کی سرپرستی میں اردو کا ایک

نہایت ترقی پسند ماہنامہ "تہذیب" شائع ہو رہا تھا۔ سہیل عظیم آبادی چونکہ شروع سے ترقی پسند اور بائیں بازو کے جمہوری خیالات کے افسانہ نگار رہیں اس لئے ملک بھر میں انکی شہرت ترقی پسند ادیب اور دانشور کی حیثیت تھی اور ہے انکی ادارت میں تہذیب کافی تھا۔ اس کا انتظار کلکتہ کے دانشوروں اور شعراء وادبا کو بڑی بیقراری سے رہا کرتا تھا۔ ملک بھر کے ترقی پسندوں کے ادبی تخلیقات اس میں اور معیاری پرچے میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ سجاد ظہیر کے وہ خطوط جو وہ حیدرآباد سندھ کے سنٹرل جیل رضیہ سجاد ظہیر کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ تہذیب میں شائع ہوتے تھے۔ انھیں خطوط کو پڑھ کر میں نمات پاکر ہند کے نام سے پہلی بار آشنا ہوا۔ جب سجاد ظہیر پاکستانی قید و بند سے نجات پاکر ہندوستان آئے تو غالباً سنہ ۱۹۵۵ میں یا اس کے بعد وہ ایک آل انڈیا مشاعرہ کے سلسلہ میں کلکتہ بھی آئے۔ پارک سرکس میدان میں جہاں مشاعرہ ہو رہا تھا سجاد ظہیر تقریر کر رہے تھے کئی ہزار انسان ایک عظیم اشتراکی ادیب اور دانشور کی تقریر سن رہے تھے۔ کلکتہ ڈاک لیبر بورڈ کے کچھ مزدور بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ ان میں سے ایک دو کو وہ تقریر پسند نہیں آئی۔ اس لئے کہ اس میں جوش یا ابھارنے اور اکسانے والا انداز نام کو بھی نہیں تھا۔ ایک مزدور نے تو بہ حیرت کہا کہ کیا یہی سجاد ظہیر ہیں جن کی اتنی شہرت ہے؟ کاش وہ مزدور ساتھی اس دھیمے لہجہ والی ٹھہری اور ٹھنڈی تقریر کی گہرائی میں اتر کر اس کے مقصد کو سمجھ سکتے بہرحال اس وقت سجاد ظہیر سے ملنا تو کیا میں ان کا چہرہ تک نہ دیکھ سکا کہ رات کا وقت تھا۔ اور میں مشاعرہ کے پنڈال سے کافی دور تھا۔ لیکن میری ملاقات اُن سے اس وقت ہوئی جب پرویز شاہدی کی دعوت پر سنہ ۱۹۶۳ میں وہ "جشن ٹیگور" کے سلسلہ میں ہونے والے آل انڈیا مشاعرہ میں شرکت کرنے کلکتہ آئے جشن ٹیگور کا وہ مشاعرہ بھی بہت پر ہجوم تھا۔ اس لئے کہ اس کے انتظام و انصرام میں پرویز شاہدی کو اردو کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے علاوہ ہندی، بنگلہ زبانوں کے فنکاروں، سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں کا تعاون بھی حاصل تھا۔ اس وقت کلکتہ ہی کیا سارے ملک بھر میں انجمن ترقی پسند مصنفین تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ سجاد ظہیر ترقی پسند ادبی تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو ہندوستان بھر میں دوبارہ زندہ کرنا اور انھیں اسی طرح فروغ دیکر محنت کش عوام تک پہنچانا چاہتے تھے جس طرح سنہ ۱۹۶۰ کے قبل یہ کام ہو رہا تھا۔ اسی لئے کلکتہ پہونچتے ہی سجاد ظہیر نے پرویز شاہدی سے خواہش ظاہر کی کہ وہ خاص طور پر نئی نسل کے فنکاروں سے ملنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پرویز شاہدی نے انہیں یہ بات بتائی اور مشورہ کیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک نشست بھی منعقد کرائی گئی جس میں سجاد ظہیر اپنی رفیقۂ حیات محترمہ رضیہ کے ساتھ شریک ہوئے، ساحر، راہی معصوم رضا نے بھی اس نشست میں شرکت کی ہم بھی لوگ اس میں موجود تھے۔ اس نشست سے پہلے میں اپنے کچھ ترقی پسند دوستوں کے ساتھ سجاد ظہیر سے انکی قیام گاہ پر مل چکا تھا۔ ملنے سے قبل ہم لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے کہ پتہ نہیں کہ وہ ہمارے ساتھ کس طرح پیش آئیں۔ مگر ہمیں دیکھتے ہی وہ برجستہ بول اٹھے "ارے بھئی میں تم نوجوانوں سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔" ان کے شفقت آمیز جملے نے ہم لوگوں کی گھبراہٹ دور کر دی اور بات چیت کے لئے ایک ایسے جانے پہچانے قسم کا ماحول پیدا ہو گیا جس میں ان کی شفقت و ہمدردی کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے جم کر ان سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء کے متعلق گفتگو کی اور اپنی طرف سے ان کو یقین دلایا کہ انجمن کی تعمیر اور ترقی پسند ادبی تحریک کے فروغ میں ہم کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ اس یقین دہانی نے ان کو مطمئن اور مسرور کر دیا۔ ہم لوگوں نے آگے چل کر کلکتہ کی نئی نسل کے باشعور افراد کے ساتھ اس یقین دہانی کا احترام کرتے ہوئے ترقی پسندی کے مسلک کی ترویج و اشاعت کے لئے جدوجہد ہمیشہ جاری رکھی۔ سجاد ظہیر نے اس وقت کھل کر کہا تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور فروغ کے اس سلسلہ میں ان کی بنیاد

امید یہ نئی نسل کے باشعور فنکاروں سے وابستہ ہیں۔ اس وقت وہ دو تین دنوں سے زیادہ کلکتہ میں ٹھہرے رہے اور اکثر ہم لوگوں سے ملنے کے لئے وقت نکالتے رہے۔ انکی رفیقۂ حیات رضیہ سجاد ظہیر جو ان کے ساتھ نہیں تھیں اپنی کہانیاں سنائیں۔ جو طبقاتی شعور اور طبقاتی بنیادوں پر لکھی گئی تھیں۔

سجاد ظہیر سے وہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی اس کے بعد اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا جو دو تین برسوں کے بعد ختم ہو گیا۔ اُس زمانہ میں وہ دہلی سے کمیونسٹ پارٹی کا ہفتہ وار ترجمان "عوامی دور" شائع کر رہے تھے۔ اس پرچہ میں میری کچھ نظمیں بھی شائع ہوئیں ایک بار ہم نے ایک نظم "سفر جاری رہے" ان کے پاس اشاعت کے لئے بھیجی۔ میری وہ نظم رجائیت کی حامل تھی اور اپنے اندر زندگی کے فروغ و ارتقا کے لئے جدوجہد کا پیام رکھتی تھی۔ میں نے اُس میں ان حالات کا تجزیہ پیش کیا تھا جو استحصال کاروں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے روئے زمین پر پائے جاتے ہیں جن کی سختی کے سبب استحصال کے شکار کروڑوں انسانوں کا ہر کروٹ غم آگیں اور سائنس عصری دھار کا خنجر بن کر رہ گئی ہے۔ مگر اس نظم میں چونکہ کرۂ ارض پر رونما ہونے والے سوشلسٹ انقلابات اور سوشلسٹ ملکوں میں پیدا ہونے والی اقتصادی آسودگی اور خوشحالی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس لئے سجاد ظہیر نے نظم تو فوراً شائع کر دی لیکن مجھے بہت نرمی اور پیار سے لکھا کہ گذشتہ دنوں جب میں (سجاد ظہیر) سوویت یونین گیا تھا تو وہاں دیکھا کہ لوگ کافی مطمئن اور اقتصادی طور پر خوشحال ہیں۔ مسرتوں کا عَلم وہاں کہیں بھی سرنگوں نہیں پایا۔ وہاں آدمی آدمی کا خون نہیں پیتا۔ سوشلسٹ یونین سوشلزم کی تعمیر و ترقی کی وجہ سے بہشت کا نمونہ بن گیا تم سوشلسٹ ملکوں سے واقفیت حاصل کرو تو بہتر ہے ——! یہ سب انھوں نے نہایت شیریں الفاظ میں لکھا اور اس کے بعد ہی ہم نے سوشلسٹ ممالک کے حالات سے آگاہی حاصل کرنی شروع کر دی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے!

یہ واقعہ ہے کہ جہاں سوشلسٹ نظامِ حیات قائم ہو چکا ہے۔ وہاں انسان مادی، اخلاقی، تہذیبی اور روحانی مسرتوں سے بھرپور ایک صاف ستھری زندگی بسر کر رہا ہے جس کے متعلق پڑھ اور سن کر دل میں ہزاروں تمنائیں بیدار ہو جاتی ہیں! کہ کاش ہمارے پیارے وطن ہندوستان میں بھی سوشلسٹ سماج کی تعمیر ہو اور یہاں کے کروڑوں ذلیل حال انسان بھی مادی و روحانی مسرتوں سے بھرپور اعلیٰ زندگی گذارنا شروع کر دیں۔ مگر اس کے لئے تو جدوجہد کرنی ہوگی بغیر ہاتھ پاؤں مارے وہ نظامِ حیات تو آ نہیں سکتا جس نے کرۂ ارض کے ایک تہائی حصہ کو انسان کی لازوال محنت کے ہاتھوں بشری آرام گاہوں میں بدل ڈالا ہے۔ سوشلسٹ ملکوں خاص کر سوویت روس میں، سائنس، ٹیکنالوجی، شاعری، ناول نگاری، افسانہ، ڈرامہ، رقص، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کی ترقی اور صورت گری نئے نئے انداز سے ہو رہی ہے۔ پرویز شاہدی کی ایک پیاری نظم "رقصِ حیات" میں ان باتوں کی طرف بہت ہی خوبصورت اشارہ ملتا ہے یہاں اس نظم کے کچھ مصرعے اگر آپ کو سناؤں تو آپ محظوظ ہوئے بغیر نہ رہیں گے:- ملاحظہ کیجئے

خطے اسی جہاں میں ایسے بھی ہیں مگر
رقصاں ہیں جن کے ساز پہ اب عظمتِ بشر
....
بڑھتے ہیں حسن و محبت کے نام پر
گاتے جہاں ہیں لوگ ترانے نئے نئے

مجھے جہاں ہیں لوگ پرانے نئے نئے

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میرے اس مختصر سے مضمون میں سید سجاد ظہیر کے تذکرہ کے علاوہ سوشلسٹ نظام حیات کی برکتوں کا ذکر ایک سے زیادہ بار آگیا ہے جو کچھ قارئین کو کھٹک سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کرادوں کہ سجاد ظہیر ایک ایسے اشتراکی ادیب اور دانشور تھے جن کا ذکر اشتراکیت، سوویت روس اور دیگر سوشلسٹ ملکوں کی بیشمار خوشگوار تبدیلیوں کے بغیر کیا ہی نہیں جاسکتا۔ شعر و ادب کا انقلابی نظریہ، اشتراکی نظام حیات، سوویت روس، کیوبا، ویت نام دیگر سوشلسٹ ممالک اور سجاد ظہیر کا نام اپنا الگ الگ وجود رکھنے کے باوجود ایک ہیں۔ سجاد ظہیر نہ صرف ہندوستان میں ترقی پسند ادب اور اشتراکی فکر و نظر کے علمبردار اور نمائندہ تھے بلکہ ان کا ایک اہم رول یہ بھی تھا کہ وہ افریشیائی ادیبوں اور دانشوروں کو عالمی اتحاد اور برادری کے مقدس اور عظیم رشتہ میں باندھنے کی جد و جہد کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر سوویت روس اور دیگر سوشلسٹ ملکوں کے دورے کرتے رہتے تھے۔ ان کا آخری دورہ ترکانیہ بھی غالباً افریشیائی ادیبوں کی تنظیم ہی کی ایک کڑی تھا۔

چونکہ میں نے سید سجاد ظہیر کے ناولوں "لندن کی ایک رات"، "روشنائی"، وغیرہ کا مطالعہ اب تک نہیں کیا ہے نہ ہی ان کا شعری مجموعہ "پگھلا نیلم" پڑھا ہے جس کا تذکرہ انھوں نے ترکانیہ جانے سے پہلے اپنے آخری خط میں کیا تھا اور پوچھا تھا کہ اگر میں اسکو نہیں پڑھ سکا ہوں تو وہ بھیج دیں گے۔ اسکے لئے "لندن کی ایک رات"، اور "روشنائی" یا "پگھلا نیلم" وغیرہ پر اس مضمون میں ایک حرف نہیں لکھ سکا حالانکہ ان کتابوں کو پڑھے بغیر بھی اُن تنقیدی مضامین کی روشنی میں کچھ لکھ سکتا تھا جو "لندن کی ایک رات"، "روشنائی" وغیرہ پر وقتاً فوقتاً ملک کے ادبی ماہناموں میں شائع ہوتے رہے ہیں مگر ایسا کرنا میں نے ادیب کی بنیادی ایمانداری کے منافی سمجھا۔ میں کوشش میں ہوں کہ اپنے قافلہ سالار کے ان تمام نقوش کا مطالعہ کروں جو وہ اپنے ناولوں اور "پگھلا نیلم" یا خود نوشت سوانح عمری کی شکل میں چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہم سے بچھڑ گئے ہیں

اگر میں ان کی کتابوں کا مطالعہ کرسکوں گا تو اپنے تاثرات ضرور پیش کروں گا ویسے اگر سید سجاد ظہیر ایک حرف بھی نہیں لکھتے تو ان کے عملی کارنامے ہی اتنے ہیں جو ان کے نام کو روشن رکھنے کے لئے بہت ہیں۔ ان کے ساتھ میرا مطلب ہے ان کے فکر و فن کے ساتھ پورا التفات تبھی ہو گا جب ہندوستان کا عظیم محنت کش طبقہ ان کے سوشلسٹ نظریوں پر کاربند ہو کر اس ملک کو دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح خوشحال اور سرسبز و شاداب بناکر اسے ابدی مسرتوں سے ہمکنار کر دیگا۔ سید سجاد ظہیر کے ترقی پسند نظریات کو علم و دانش اور شعر و ادب کے میدانوں میں نیز نئی نسل کے ذہین اور باشعور افراد معاشرہ کے درمیان پھیلانے اور فروغ دینے ہی سے ان کی شخصیت اور فکر و فن کے تمام پہلو خود بخود اجاگر ہو کر ہمارے سامنے آجائیں گے اس لئے کہ ان کا سب سے بڑا مقصد زندگی اور اس کے ادب کے ترقی پسند نظریوں کی ترویج و اشاعت اور تبلیغ کرنا تھا جسکو وہ اپنی آخری سانس تک نہایت عزم و ثبات و انہماک کے ساتھ ہمہ گیر پیمانہ پر کرتے رہے آئیے ہم اور آپ ان کے نقش قدم پر چل کر ان کے نام کی لو اور عظمت کے شعلوں کو اور بھی تیز تر کر دیں۔

جگن ناتھ آزاد

سجے بھائی

۱۳ ستمبر کی بات ہے شام کے وقت میں اُوپر کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ نیچے گھر کے لوگ ٹیلی وِژن دیکھ رہے تھے کہ میری بیوی گھبراہٹ کے عالم میں اوپر آ گئی اور بولی سجے بھائی اِن دنوں کہاں تھے؟ میں نے سر اُوپر اُٹھایا اور کہا کہاں تھے یا کہاں ہیں؟ پچھلے دِنوں جب میں دہلی میں تھا تو وہ ماسکو گئے ہوئے تھے شاید وہاں سے اُن کا لندن جانے کا ارادہ تھا واپس آنے ہی والے ہوں گے۔ کیوں کیا بات ہے؟ وہ انتہائی افسردہ لہجے میں کہنے لگی ابھی ابھی ٹیلی وِژن پر خبر آئی ہے۔ اُس کی بات ابھی نامکمل ہی تھی۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ پھر بھی میں نے سوال کر ہی دیا۔ کیا خبر آئی ہے بولی۔ سجے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے سنتے ہی پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تاہم یقین نہ آیا اور جلدی سے نیچے ٹیلی وِژن والے کمرے میں آیا جیسے کہ ٹیلی وِژن کا نیوز ریڈر میرے انتظار میں اُس خبر پہ رکا ہوا ہوگا۔ خبریں آ کے چل چکی تھیں۔ بچوں نے تائید کر دی ابھی نیوز ریڈر نے بتایا ہے سجاد ظہیر چچا کا روس میں انتقال ہو گیا ہے ——

اور میں خیالات میں ڈوب گیا... کیا سجے بھائی کی نعش روس میں دفن کی جائے گی یا ہندوستان میں لائی جائیگی اور پھر پینتیس برس کے واقعات ایک فلم کی طرح میری نظر کے سامنے گھومنے لگے۔

۱۹۳۸ء کا زمانہ ہے۔ میرے والد گارڈن کالج راولپنڈی میں اُردو کے استاد ہیں۔ اٹھارہ انیس برس کی میری عمر ہے۔ ایک نوجوان ہمارے گھر میں آتا ہے۔ ادب میں ترقی پسندی پر باتیں ہوتی ہیں۔ والد کہتے ہیں لیکن میں ادب میں فحاشی اور عریانی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ نوجوان جواب دیتا ہے محروم صاحب! ترقی پسندی کے مخالفوں نے یہ باتیں ترقی پسندی کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہیں ان چیزوں کا ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لاہور میں مجھ سے علامہ اقبال نے بھی یہی کہا تھا۔ یہ ہمارے مخالفوں کا پراپیگنڈہ ہے۔!

والد یہ ساری باتیں سن کر کہتے تم کل ہمارے کالج میں ادب میں ترقی پسندی کے موضوع پر تقریر کرو تاکہ کالج کے دوسرے اساتذہ اور طلبہ کو بھی بحث میں حصہ لینے کا موقع مل سکے۔ یہ نوجوان سید سجاد ظہیر تھے، سر وزیر حسن مرحوم کے فرزند، گھرا ہوا گورا چٹا رنگ نکلتا ہوا قد مجھے اُن کا یو۔ پی کا شستہ لب و لہجہ بہت بھلا لگا —— اور دوسرے دن گارڈن کالج راولپنڈی میں سجاد ظہیر کی تقریر ہوئی۔ والد نے صدارت کی سجاد ظہیر نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا اُس سے زیادہ مجھے ان کے لب و لہجہ سے دلچسپی رہی کتنی عمدہ اردو میں وہ بول رہے تھے۔ جیسے کانوں میں رس گھول رہے ہوں

سجاد ظہیر نے یہ سارا واقعہ اپنی تصنیف "روشنائی" میں اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں

اُردو کی ادبی دنیا میں راولپنڈی کی سب سے مشہور ہستی پنڈت تلوک چند محروم کی تھی پنڈی کی انجمن یا گارڈن کالج کی اردو سوسائٹی کی جانب سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ترقی پسند ادب پر مجھے تقریر کرنا تھی، مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی جب میں اس جلسے میں پہنچنے کے بعد دیکھا کہ حضرت محروم اس کے صدر ہیں، وہ گارڈن کالج میں اردو، فارسی کے پروفیسر تھے اور ان کی عمر ساٹھ کے قریب

رہی ہوگی ۔ ایسے زبان داں اور قدیم مکتبِ خیال کے قابلِ احترام استاد کے سامنے زبان کھولتے ہوئے مجھے کافی جھجک محسوس ہو رہی تھی ۔ میں بڑی احتیاط سے بولا ۔ میری تقریر کے خاتمہ پر پنڈت جی نے فرمایا کہ میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں دوسرے خیالات رکھتا تھا ۔ لیکن اگر اس کے مقاصد وہی ہیں جو جلسے میں بیان کئے گئے تو اس سے بھلا کیسے اختلاف ہو سکتا ہے ۔ ہم نے اُن کے اس جملے کو تحریک کے اور اپنے لئے باعثِ برکت سمجھا ۔

بات آئی گئی ہو گئی چند برس بعد ہندوستان کے دو حصے ہو گئے ہندوستان اور پاکستان ۔ میں راولپنڈی اور لاہور کو چھوڑ کر دہلی آ گیا ۔ ترقی پسند تحریک سے میری دلچسپی کا صحیح معنوں میں آغاز دراصل تقسیمِ ملک کے بعد ہی ہوا ۔ اس زمانے میں سجاد ظہیر کا نام ہر زبان پر تھا ۔ لیکن سجاد ظہیر خود کہاں تھے ۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی نے انہیں پارٹی کی تنظیم کیلئے پاکستان بھیج دیا تھا ۔ انہیں وہاں گئے تھوڑی ہی مدت ہوئی تھی کہ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلہ میں گرفتاریوں کا ایک چکر شروع ہو گیا جس میں فیض احمد فیض اور جنرل اکبر خان کے ساتھ سجاد ظہیر بھی گرفتار ہو گئے

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے امیرِ کارواں تھے ہم نو واردانِ شوق کے لئے ان کا نام ایک علامت بن گیا تھا ایک سمبل بن گیا تھا ۔ ان کی رفیقۂ حیات رضیہ سجاد ظہیر لکھنؤ میں تھیں ۔ یہ مکان ہم لوگوں کے لئے ایک سمدھ گھر کی حیثیت رکھتا تھا لکھنؤ جانا ہوتا لکھنؤ سے گذرنا ہوتا میرے لئے اس مکان پر حاضری دینا رضیہ بھابی اور بچوں سے ملنا ایک معمول بن گیا اور تھوڑی ہی مدت میں صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی جیسے میں اسی گھر کا ایک فرد ہوں

ادھر سکھر جیل سے بنے بھائی کے خطوط رضیہ بھابی کے نام خاصی باقاعدگی سے آ رہے تھے بعد میں لکھنؤ جیل و سکھر جیل کے خطوط " نقوشِ زنداں " کے نام سے شائع ہوئے ۔ ایک خط میں میرا ذکر بھی تھا اور یوں کہ ایک مقالہ میں پاکستان کے شعراء کا ذکر کرتے ہوئے میں نے حفیظ جالندھری کو اردو کے اہم ترین شعراء میں شمار کیا تھا یہ مقالہ " شاہراہ " میں چھپا تھا اور بنے بھائی کی نظر سے گذرا تھا انہیں میرا اندازِ نگاہ پسند نہ آیا اور انہوں نے لکھا آزاد نے در پردہ حفیظ کو فیض پر ترجیح دینے کی کوشش ہے اس سے آزاد کی رجعت پسندی ظاہر ہوتی ہے وہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے نظرئے کی شدت کا زمانہ تھا رضیہ بھابی کو بھی میرے خیالات ناگوار گذرے تھے لیکن اس سے ہمارے باہمی مراسم میں کوئی فرق نہ آیا

سکھر جیل سے سجاد ظہیر کے خطوط حکومت پاکستان کے سنسر کی قینچی سے گذر کر لکھنؤ تک پہونچتے تھے بعض خطوط تو جوں کے توں مل جاتے تھے بعض میں اکثر فقروں پر اس طرح سیاہی پھیری ہوتی کہ سارا مفہوم غتربود ہو جاتا تھا

ایک دفعہ کا ذکر ہے میں لکھنؤ میں وزیر حسن منزل میں پہونچا اپنے بھائی کی بیٹی نسیم نے مجھے بنے بھائی کا ایک خط دکھایا جس کے اکثر فقروں پر سیاہی پھیری ہوئی تھی رضیہ بھابی نے کہا کہ عرش اس خط نے تم پر اتنا بھی اثر نہیں کیا کہ تم اس کے بارے میں نظم کہہ سکتے نہ جانے ان کے الفاظ میں کیا طلسم تھا وہیں اس سنسر شدہ خط کے بارے میں فی البدیہہ ایک نظم ہو گئی

یہ اک معصوم فقرے پر سیاہی پھیرنے والو
کسی نے وقت کی پرواز کو روکا ہے اب تک
کسی بلبل کے نغمے تک کوئی صیاد پہونچا بھی
کسی نے گرمیِ آواز کو روکا بھی ہے اب تک
شکست انجام کوئی ساز ہو جائے تو ہو جائے
کسی نے نغمہ ہائے ساز کو روکا بھی ہے اب تک
کسی نے پھول کی خوشبو کو بھی زنجیر پہنائی
کسی نے گلستاں کی راہ کو روکا بھی ہے اب تک

یہ الفاظِ محبت باپ نے بیٹی کو لکھے ہیں — ان الفاظِ محبت سے یہ وحشت کس لئے آخر
جو اپنے باپ کا ہر لفظ پڑھ لیتی تو کیا ہوتا
یہ اک معصوم بچی سے عداوت کس لئے آخر

یہ جن دو چار لفظوں پہ سیاہی تم نے پھیری ہے — انہی لفظوں میں پوشیدہ ہے سورج کی درخشانی
غلط ہے جو ظلمت آج اس ننھے سے ورقے پر — اسی ظلمت پہ بجلی بن کے ٹوٹے گی یہ تابانی
یہی تحریر جس کو تم نے روکا ہے ابھرنے سے — جب ابھرے گی تو بن جائے گی اک سیلابِ نورانی
سفیدی پر سیاہی کی لکیریں کھینچنے والو — یہ کب تک شانِ مخفی؟ یہ کب تک جبرِ خاقانی
وہ دیکھو فکرِ انسانی سے ابھری نور کی دنیا — بڑھا دیتا ہے زنداں سے وہ اک سیلابِ لافانی

خدا حافظ تمہاری ان سیاہی کی لکیروں کا
معاذ اللہ منبعِ نور کا اندازِ طغیانی

یہ سنہ ۵۳ء کی بات ہے!

سجاد ظہیر ہمارے صفِ اول کے شاعر تھے، صفِ اول کے نثر نگار تھے لیکن نام و نمود سے کوسوں دور رہتے تھے، یہاں تک کہ دہلی کی ادبی سرگرمیوں سے بھی دور ہی رہتے تھے۔ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے لیکن سامع کی حیثیت سے۔ ہاں مشاعروں کے بعد جو مخصوص نشستیں ہوتی تھیں ان میں اپنا کلام بھی سنا دیتے تھے۔ ان نشستوں میں صدارت اکثر ان کے سپرد ہوتی تھی اور وہ اپنی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اردو اور اس مسکراہٹ کے طفیل جو ہمیشہ ان کے خوبصورت چہرے پر کھیلتی رہتی تھی محفل کو شگفتہ تر بنا دیا کرتے تھے۔ ایسی محفلوں میں مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے "جگن ناتھ تم میرے قریب اگر بیٹھ جاؤ تمہاری مدد کے بغیر میں صدارت نہ کر سکوں گا۔" دو چار محفلوں میں جب انہوں نے ایسا کہا تو تاباں اور بعض دوسرے دوستوں نے ازراہِ مزاح مجھے نائب صدر کا لقب دے دیا۔ جس محفل میں بنے بھائی موجود ہوں اور میں نہ پہنچ سکوں تو یاروں کا فقرہ اکثر یہ ہوتا تھا "بھئی ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی نائب صدر تو آئے نہیں" اور اگر میں موجود ہوں اور بنے بھائی نہ ہوں تو تان کچھ ایسے ہی فقرے پر ٹوٹتی تھی کہ "لیجئے نائب صدر آ گئے اور صدر ابھی تک نہیں آئے۔"

کوئی تیس برس کی بات ہے بنے بھائی صادق صاحب مرحوم کی دعوت پر کشمیر تشریف لائے، رضیہ بھابھی ان کے ساتھ تھیں۔ صادق صاحب ہی کے مہمان رہے۔ میری تقریباً ہر شام ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ اسی قیام کے دوران میں کشمیر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ذکر آیا اور یہ طے پایا کہ سری نگر میں از سرِ نو انجمن قائم کی جائے۔ اس سلسلے میں میرے ہی دفتر میں مسلسل کئی روز تک وہ آتے رہے، بحث مباحثے ہوتے رہے اور طے پایا کہ کشمیر ڈیموکریٹک رائٹرس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک ادبی تنظیم کشمیر میں قائم کی جائے۔ چنانچہ یہ تنظیم قائم ہوئی۔ بنے بھائی ہی نے اسکی بنیاد رکھی اور کوئی ڈھائی برس تک یہ تنظیم کشمیر میں علمی اور ادبی کام کرتی رہی۔

بنے بھائی ہر بزم کے محبوب تھے اور ع ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ ان کا حلقۂ احباب کسی ایک ملک یا ایک براعظم تک محدود نہ تھا بلکہ ہندوستان، پاکستان، روس، کیوبا، مشرقی اور مغربی یوروپ یا انگلستان ہر جگہ ان کے چاہنے والے موجود تھے اور نہیں اسی ہماری وادی میں بھی ان کے عزیز دوستوں کی کمی نہیں۔ صادق صاحب مرحوم، ہمارے وزیرِ اعلیٰ سید میر قاسم، پیر عبدالاحد، پیر غیاث الدین، موتی لال مصری، ڈاکٹر مرزا، دینا ناتھ نادم اور کتنے ہی شاعر و ادیب ان کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ کس کس کا نام لیا جائے، یہ فہرست مکمل ہو ہی کہاں سکتی ہے!

سیف زباں سجاد ظہیر

۱۳۹۴ھ

مغیث الدین فریدی

سلام تجھ پہ کہ دار و رسن کی منزل سے
بڑے خلوص بڑے انہماک سے گذرا
ہے تیرے خون سے کشت وفا کی سیرابی
ہجوم برق و بلا سے شب خاک سے گذرا
تو سرفروش مجاہد تھا، تیرا سوز دروں
وطن کی خاک کو برق و شرر بناتا تھا
تو رہنما، تو سپاہی، تو ایک مرد خلیق
قدم قدم پہ تو شمع وفا جلاتا تھا
جبیں پہ پختہ تبسم سے بانکپن کی ادا
نظر میں جلوۂ شام اودھ کی رعنائی
رفیق فاقہ کشوں کا، عوام کا ساتھی
دلوں پہ کی ہے بغیر کلاہ دارائی

قلم کی نوک سے تو نے، بہ فیض فکر و نظر
کبھی سناں کا، کبھی موقلم کا کام لیا
نئے اُفق سے نکالے، نئے مہ و خورشید
ادب کو حسن یقیں، فن کو اعتماد دیا
تو آج ہم میں نہیں، تیری یادمانی ہے
فضا کو رنگ چمن کو نکھار دے کے گیا
جنوں نے تیرے کھلائے ہیں آگہی کے چمن
وطن کو اپنے پیام بہار دے کے گیا
چمن سے دور فدائے چمن کو موت آئی
یہ حادثہ کبھی تہہ شاخ آشیاں نہ ہوا
ہوئی ہے شامل تاریخ تیری آزادی
ترا نشان نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

۲۳ + ۱۹۵۰ = ۱۹۷۳ (فانی)

اسلم ہندی
(ایم، اے۔ علیگ)

بنّے بھائی

ایک مثالی انسان

بنّے بھائی کے نام میں جو مٹھاس، پیار اور اپنائیت ہے وہ سجاد ظہیر میں کہاں؟ بنّے بھائی انکی عرفیت ہے۔ یہ عرفیت ان ہی سے مخصوص نہیں بلکہ بہتوں کے حصہ میں آچکی ہے اور بہتوں کے حصہ میں آئیگی لیکن اس عرفیت نے جو انٹرنیشنل پوزیشن حاصل کی وہ ہر ایک کے نصیب میں کہاں

غالب نمبر، مومن نمبر، حسرت نمبر، اقبال نمبر اور معلوم کتنے نمبر نکل چکے ہیں اور نکلتے ہی رہیں گے۔ ان نمبروں کے نکالنے کا کچھ مقصد ہوتا ہے جس شخص کا نمبر نکالا جارہا ہے اس کے نام کو زندگی بخشنا ہے اور وہ کام جو اس نے اپنی حیات مستعد میں انجام دیئے ہیں ان کو بھی اس طور سے پیش کرنا تاکہ آنے والی نسلیں ان کے دکھائے ہوئے راستہ پر گامزن ہوسکیں۔ ایسی ہستیاں قومی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں

سجاد ظہیر قومی سرمایہ کیا بلکہ وہ بین الاقوامی سرمایہ تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ بین الاقوامی تحریکوں سے وابستہ تھے بلکہ اس لئے کہ انھوں نے بین الاقوامی سطح پر سیاست اور ادب کے ذریعہ عالم انسانیت کی خدمت کی۔ یہاں تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں۔ یہاں تو ان کے مزاج کردار اور شخصیت پر ہلکی سی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں

وہ ایک شریف انسان تھے۔ شرافت کے مروجہ معیار کے مطابق نہیں۔ مروجہ معیار کیا ہے، عالی نسبی، دولت و ثروت، علم و اقتدار مختصر یہ کہ ان کا مرکب شدہ بڑاپن۔ ایسے بڑے پن کو انھوں نے ٹھکرایا ہے اسی لئے وہ سچے شریف انسان تھے اندر باہر دونوں سے کھرے۔ انکی زندگی میں ملمع سازی آپ کو کہیں سے نظر نہیں آئی

اقتدار دنیا کے بدلے انھوں نے اقتدار انسانیت کو اپنایا اور ساری زندگی وہ ایک غریب انسان کی زندگی بسر کرکے باطل نظاموں سے حوصلہ مندی سے ٹکراتے رہے۔ انکی تحریر، تقریر، افکار اور کردار میں توازن تھا وہ نظریہ میں خالصتاً انقلابی تھے مگر عملی میدان میں وہ متوازن تھے۔ انقلابی نظریہ کو وہ کس طرح عملی جامہ پہنائیں اسکو انکی زیادہ فکر رہتی تھی۔ وہ انقلابی تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کو فروغ دینے کے لئے بھی انھوں

نے نہایت تدبر اور دور اندیشی کے ساتھ اعتدالی راہیں اختیار کیں اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں برابر کامیابیاں حاصل کرتے رہے وہ جس سے ملے اس کے دل میں گھر کر گئے۔ وہ لوگوں سے نہیں ان کے دلوں سے ہم کلام ہوتے تھے ان کا تعلق وقتی نہیں دائمی ہوتا تھا ایک بار جو ان سے ملتا تھا وہ سدا ان کو یاد رکھتا تھا۔

وہ متانت کے پیکر تھے۔ انکی مسکراہٹ غمِ پنہاں کی غماز تھی۔ انکی آنکھیں سے محبت جھلکا کرتی تھیں۔ انھوں نے مذہب اور دھرم کی روح کو گلے لگا رکھا تھا۔ انھیں غم زدوں سے پیار تھا۔ ان ہی کیلئے انکی پوری زندگی وقف تھی۔ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کے انسان تھے۔ ان ہی سے انکی اندھیری دنیا میں جگنو جگمگایا کرتے تھے ایکبار میری ملاقات جب ان سے ہوئی تو چپکے سے میرے دل نے مجھ سے کہا۔ دیکھو یہ ایک انسان ہے۔ ایسے انسانوں کی ہمارے ملک کو کتنی ضرورت ہے حقیقت یہ ہے کہ ایک خادم انسانیت سے ہمارا ملک محروم ہو گیا۔ دل کی دنیا پر بدلیاں چھا گئیں لیکن یہی بدلیاں ایک روز پیغام بہاراں لائیں گی اور روحِ ظہیر کو مسرور کریں گی۔ جو تخم ریزی اس نے کی کہ وہ آج لالہ وگل کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ افق مشرق پر سرخ سویرا نمودار ہے

(اسلم ہندی)



کوشش کیجئے

چھوٹے چھوٹے کام بھی بڑھیا طریقے سے
کرنے کی۔ اس طرح ہم سب قومی تعمیر کے
کام میں حصہ لے سکتے ہیں۔"

— اندرا گاندھی

آئیے! قومی تعمیر کے کام میں جُٹ جائیں

مناظر عاشق ہرگانوی

خطوطِ زنداں

(سجاد ظہیر کے چند خطوط)

خطوط انسانی جذبات، خیالات، محسوسات اور تاثرات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں وہ ساری باتیں جنھیں انسانی ذہن سوچتا سمجھتا ہے، بے تکلف انداز میں خط کے ذریعہ ہی ذہن کے دریچے سے جھانک سکتی ہے!

یہاں میں سجاد ظہیر کے چند خطوط پیش کر رہا ہوں۔ یہ خطوط جیل سے لکھے گئے تھے اور یہ وہ خط ہیں جنھیں تاریخ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان خطوط میں ایک تہذیب انگڑائی لے رہی ہے۔ ملک اور سماج کی بدلتی ہوئی قدریں جن میں سموئی ہیں اور ایک ادیب، ایک شاعر اور ایک شوہر کے جذبات و محسوسات کی خوشبو رچی بسی ہے

پہلا خط قاضی عبدالغفار کے نام ہے!

سنٹرل جیل
بلوچستان
۸ر مارچ ۵۴ء

محترم قاضی صاحب زاد لطفہٗ تسلیم

آپکی عنایتوں کا کیسے شکریہ ادا کروں۔ آپکی بھیجی ہوئی سب کتابیں بارے خدا خدا کر کے گزشتہ ہفتے مجھے مل گئیں! دو مہینوں سے زیادہ ہی ہوئے جب رضیہ نے مطلع کیا تھا کہ آپکی انجمن کی شائع کی ہوئی کتابیں بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو فوراً فرطِ شوق اور مسرت سے لکھا کہ وہ براہ راست میرے پتے پر علیگڑھ سے بھیجی جائیں۔ لیکن قبل اس کے کہ میری ہدایت ان کو ملے وہ لاہور کے پتے پر روانہ کر دی گئیں پھر وہاں آکر مجھے معلوم نہیں کتنے دنوں پڑی رہیں بہت سی تاکیدوں اور طعن و تشنیع کے بعد وہاں سے بھیجی گئیں اور دو برجو مصائب کے پہاڑ ٹوٹے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی بڑی مشکل ہے کہ ہند اور پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں اور رسالوں کے ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے میں سخت رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہاں جو ادبی رسالے شائع ہوتے تھے ان کے بیشتر خریدار تقسیم کے بعد بھی ہندوستان ہی میں تھے

(مثلاً ساقی، ادب لطیف، سویرا وغیرہ) اب یہ سب ہائے واویلا کر رہے ہیں کہ روپیہ کی ملین ویں کی بندش کے سبب
سے ہند کا مارکیٹ ان کے ہاتھ سے نکل گیا پھر کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی الگ رہی ہے اسی طرح وہاں کے رسالے یہاں نہیں بک سکتے
خیر اس قسم کی تو بہت سی باتیں ہیں جن کو آپ مجھ سے بہتر جانتے اور محسوس کرتے ہوں

آپ سے اتنی بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے سمجھ میں نہیں آتا شروع کہاں سے کروں
اور اگر شروع بھی کروں تو بڑی مشکل ہے یہ جو ایک موقع آپ کو خط لکھنے کے لئے ملا ہے ابھی سب کی سب لکھ دیے دوں اور پھر سب ایسی
بھی نہیں کہ کہی جا سکیں

حیات اجمل پڑھنے کا مدتوں سے اشتیاق تھا، بمبئی میں اس کے مسودے کے کچھ حصے پڑھے بھی پھر
شکر ہے کہ یہ خواہش کئی برس بعد ہی لیکن پوری تو ہو گئی سب سے پہلے میں نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا اور کل ختم کر دی۔ آپکی
تحریر میں شگفتگی اور روانی ایسی ہے کہ ایک بار شروع کر کے کتاب کو رکھنے کا دل ہی نہیں چاہتا۔ پھر اس کتاب کا موضوع ایسا
جس میں شمل ہیں کے بہترین نفوس میں سے ایک کی انھیں کا دشوں اور کاوشوں کا ذکر ہے جو ہم ان کے فرزند اور شاگرد آخر کسی
نہ کسی طرح دوسرے ماحول اور دوسری طرح سے آج بھی جاری کئے ہوئے ہے اور یہ قصہ اتنا پارینہ تو نہیں یہ اچھا ہے کہ انکی
حیات کا مطالعہ کر کے ہم اپنے سینوں کے داغ تازہ کرتے ہیں۔ یوں بھی چراغ سے چراغ جلیں گے اور مجھے اسمیں ذرا بھی شک
نہیں کہ ہماری حیات ہی کی تاریکیاں بالآخر چھٹیں گی اور تہذیب و تعمیر امن وجودت کے جو خواب ان بزرگوں نے دیکھے تھے
شرمندۂ تعبیر ہوں گے —

حیات اجمل میں آپ نے ایک (واقعہ) عظیم لکھا ہے جس سے تزکیۂ نفس تو ضرور ہوتا ہے جیسا کہ ہر ایک
سچے اور بڑے المیہ کا خاصہ ہے۔ اس لئے کہ کتاب تاریخ و سیاست بلکہ دور حاضر کی زندہ تاریخ اور سیاست سے متعلق ہے
اس میں بھی ان نظریوں اور اعمال کا تجزیہ نہیں ہے اور اگر ہے تو غیر تشفی بخش ہے جن کے نتیجہ کے طور پر متواتر ناکامیوں اور ناامیدیوں
کا سامنا دیکھنا پڑا اور اگر یہ تجزیہ نہ ہو تو پھر آگے کا وہ راستہ کیسے نظر آئے گا جو گذشتہ ناکامیوں سے گذرتا ہو، کامیابی اور کامرانی کی
منزل تک ہم کو پہونچائے گا وہ الم جس سے تزکیۂ نفس ہو پاک اور قابل احترام ہے
راہ حق پر چلنے والوں کی شہادت ہی تاثر رکھتی ہے۔ لیکن اگر ملال اور مایوسی کے بادل دلوں پر چھا جائیں
اور ہمارے عزائم اور ارادے بلند ہونے کے بجائے پست ہو جائیں یا ٹوٹ جائیں اور ایک حزنیہ کیفیت پیدا ہو جائے تو ہم ارتقائے
زندگی کے معمار کیسے بنیں گے؟ کیا خیال ہے آپ کا

آپ نے اتنی بہت ساری اچھی اچھی کتابیں انجمن کی طرف سے شائع کر دیں، اس پر میری مبارکباد
قبول فرمائیے اگر مزید خط لکھنے کی اجازت ملی تو آئندہ کسی موقع پر، جب آج اس خط کا جواب بھیجدینگے تو میں ان میں سے چند
کے متعلق اپنی رائے آپ کو لکھوں گا۔ یہ تو میرا فرض بھی ہے۔ گذشتہ سال جنوری نے ترقی پسند ادب میرے پاس بھیجدی تھی مجھے
اسکی خاص خوشی ہے کہ انجمن جدید ادب کی اس صنف کی کتابیں بھی شائع کرنے لگی ہے۔ مجروح، مخدوم اور [illegible] کے مختصر انتخابات
شائع کرنے کا خیال بہت اچھا ہے! اس طرح انجمن کے کاموں میں ایک عمومیت پیدا ہو گی جسکی بہت ضرورت ہے۔

پرانی انجمن تذکروں کی قسم کی چیزوں کے چھاپنے کے چکر میں ایسا رہی کہ اس سے نکل ہی نہ سکی گو وہ بھی ضروری کام تھا لیکن نسبتاً۔ مہ ادب پہ بھی اتنا تھا تو دور رہنا چاہیے۔ جتنا کہ کلاسیکی ادب پہ۔ اس طرح ایک صحیح توازن برقرار رہے گا۔ آپکی مطبوعات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایسا ہی کر رہے ہیں

اخباروں میں ڈاکٹر صاحب کی سرکردگی میں اردو وفد کا حال دیکھا تھا دعا ہے کہ آپکی مساعی کامیاب ہوں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہو تو ان کو میری طرف سے بہت بہت آداب و تسلیم کہئے گا امید ہے کہ ان کی صحت اچھی ہو گی اور انکی آنکھوں کی تکلیف رفع ہو گئی ہو گی

کل یہ خبر لاہور کے ایک اردو اخبار میں نظر سے گذری کہ مولانا نے بالآخر ترجمان القرآن کی تیسری جلد مکمل کر لی اور یہ کہ دہلی میں انکی ہی نگرانی میں کتابت ہو رہی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو آپ کو ضرور اس کا علم ہو گا اس کے دیکھنے کا بہت اشتیاق رہے گا۔ چھپ کر کب تک تیار ہو جائے گی؟ مولانا کا مزاج کیسا ہے؟ آپ ملیں تو میری طرف سے دست بستہ عرض کر دیجائے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

کافی عرصہ ہوا، دہلی کے رسالے شاہراہ میں ایک گروپ فوٹو دیکھا تھا جسمیں آپ بھی تھے۔ آپ کی اس طرح زیارت کر کے جو خوشی ہوئی اسکے ساتھ تردد بھی شامل تھا اس لئے کہ اس سے پہلے آپکی طویل علالت کی خبر سنی تھی اور تصویر دیکھنے پر کافی بھلے ہوئے نظر آئے تھے اور نقاہت ظاہر تھی امید ہے کہ آپ بالکل اچھے اور مضبوط ہوں گے۔ اس کے بارے میں لکھئے تعلق خاطر ہے

رضیہ نے آپکو مطلع کر دیا ہے کہ میں جو کتاب لکھ رہا تھا اس کا مسودہ مکمل ہو گیا ہے انھوں نے مجھے آپ کا وہ خط بھیجا ہے جس میں آپنے اس مسودہ کو دیکھنے کے لئے طلب فرمایا ہے اس کے لئے میں بیحد شکر گذار ہوں، میری بڑی دلی خواہش ہے کہ اگر آپ اسے پسند کریں تو انجمن ہی اُسے شائع کرے۔ لیکن اب میرے سامنے بہت بڑا مرحلہ یہ ہے کہ یہ مسودہ آپ تک پہونچایا کیسے جائے میں چاہتا ہوں کہ اسکی ایک نقل کر لوں اس کے لئے مجھے دو تین چار سو صفحات کی کتاب لکھ لینا نسبتاً اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اسکی نقل کرنا یہاں کوئی ایسا ساتھی بھی نہیں جو اس کام میں میرا ہاتھ بٹائے۔ میرے ساتھی ایک فوجی بریگیڈیر صدیق خان صاحب ہیں۔ بڑے نیک اور اچھے آدمی ہیں لیکن انھیں ادب سے مس نہیں اور یہ اتنے بڑے عہدے سے اس طرح ہٹائے جانے کے بعد اور سات سال کی قید با مشقت کی سزا پانے کے بعد اب وہ نماز وظیفہ خوانی یا پھر کھانے پکانے میں بیشتر مشغول رہتے ہیں۔ طعام کے سلسلہ میں انکی کاوشوں سے مجھے بھی ٹھوس فائدہ ہوتا ہے اور انکی بہرحال امید ہے کہ ان کی دعائیں جب مستجاب ہونگی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جو ان کے مقابلہ میں چھوٹے پاپی ہیں یعنی صرف چار سالہ قیدی، انھیں بھی اللہ کی رحمت اپنے دامن میں نہ لے

علی گڈھ میں میرے بہت سارے عزیز دوست اور کرم فرما ہیں ان سے ملئے اور میرا ذکر آئے تو انھیں میری طرف سے سلام کہئے گا۔ خاص طور پر ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر عبد العلیم اور جذبی کو۔ میرے بھانجے ڈاکٹر نورالحسن کبھی وہاں ہیں معلوم نہیں آپ انھیں جانتے ہیں یا نہیں انھیں اگر ملیں تو میری دعا کہیئے میری ایک بھتیجی آسیہ ظہیر اب علی گڈھ میں ہسٹری پڑھانے پہ مقرر ہو گئی ہے۔ میں تو اس سے برسوں سے نہیں ملا لیکن سنا ہے کہ بڑی سمجھدار بچی ہے۔ آپ سے ملاقات ہوئی

فقط نیازکیش سجاد ظہیر

قاضی عبدالغفار کے نام مذکورہ بالا خط میں اردو کا مسئلہ، جیل میں کتابوں کی نایابی، ملک کی تقسیم کے بعد مشہور و معروف ملک کی زبوں حالی، حیات اجمل کی پذیرائی، انجمن ترقی اردو کی طرف سے اچھی اور معیاری کتابوں کی اشاعت پر اظہار خوشی اور چند دیگر امور کا ذکر ہے!

سجاد ظہیر کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کے امام تھے آپ ہی نے ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند انجمن قائم کی تھی کمیونسٹ ہونے کے جرم میں آپ کو دوسری جنگ عظیم میں لکھنؤ کے سنٹرل جیل میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ وہاں سے انہوں نے اپنی بیوی کو جو خطوط لکھے وہ خطوط ۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں یہاں میں دو خط پیش کر رہا ہوں

سنٹرل جیل، لکھنؤ

۱۸ اگست ۱۹۴۰ء

میری جان، میری بچی کی ماں، میری پیاری اچھی بیوی! ولادت کے بعد میں تمہیں دو خط بھیج چکا ہوں، جو ملے ہوں گے، تین دن سے تمہارے گھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ تعجب ہے حالانکہ میں نے یہ لکھ دیا تھا کہ دو حرف روزانہ کوئی نہ کوئی خیریت کے لکھ دیا کرے معلوم ہوتا ہے، ڈیڈی اور ممی نواسی پیدا ہونے کی خوشی میں یہ بھول گئے

تم تو ابھی کمزور ہو گی۔ میری پیاری اچھی تم ماں ہو گئیں ایک پیارا لفظ ہے تم اپنی خیریت کے متعلق کسی سے بالتفصیل لکھوا دو۔ کوئی بات نہ چھوٹے۔ ولادت کے بعد ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟ انکی ہدایت کیا ہے؟ تمہاری غذا کیا ہے؟ کب تک چل پھر سکو گی؟ اور نارمل زندگی کب سے بسر کرو گی؟ میری جان! ڈاکٹروں کی ہدایت پر پورا عمل ہونا چاہیئے یہ زمانہ سخت احتیاط کا ہے۔ تم اٹھ کر چلنے میں یا غذا کے معاملہ میں جلدی اور بد احتیاطی نہ کرنا

.... کیا تم بچی کو دودھ پلانے لگی ہو؟ دودھ کافی ہوتا ہے یا نہیں اور اس سلسلہ میں کوئی تکلیف تو تم کو نہیں ہے۔ اور کوئی شکایت نہیں سب تفصیل سے لکھوانا۔ میں اپنے اس کے پہلے والے خط میں بچی کا نام تجویز کر کے تمہیں لکھ چکا ہوں۔ مجھے تو یہ نام۔ نجم السحر، روز بروز زیادہ پسند آتا جاتا ہے امید ہے کہ تم اور تمہارے والدین بھی پسند کریں گے۔ عرف نجمہ بھی بہت اچھا خوش گوار اور خوش آواز ہے۔ اس نام میں ایک خوبی یہ ہے کہ معمولی نہیں ممتاز ہے

میری جان میں بہت خوش اور بہت مغموم۔ خوش چونکہ اب یہ چھوٹی سی معصوم جان ہمارے اور تمہارے درمیان میں عشق و محبت کی نشانی اور سند بہترین اور عزیز ترین سند موجود ہو گئی رنج اس لئے کہ ہم ایسی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ لیکن تم نے جس ہمت اور بہادری کے ساتھ اس سخت تکلیف دہ مرحلہ کو کاٹ دیا ہے۔ اس سے میرے دل کو سکون اور تقویت پہونچی ہے۔ ایسی بہادر بیوی، جانباز ماں اور سچے ساتھی پر کون مرد فخر نہ کرے گا۔ تمہاری بچی جب بڑی ہو گی تو اس زمانہ کو کبھی نہیں بھول سکتی

اگر ممکن ہو اور زیادہ زحمت نہ ہو تو اپنی — اپنی ضرور اور بچی کی ایک ساتھ کھینچی ہوئی تصویر مجھے منعم میاں کے ہاتھ بھیج دو! پیاری! تم موجودہ حالت کے ناساعد ہونے کی وجہ سے زیادہ پریشان مت ہوا کرو اور اپنے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور افکار مت اٹھنے دیا کرو:

..... بنی! تم اب اگر لکھ سکتی ہو تو خود ذرا اپنی بچی کے بارے میں لکھو کہ اس کی عادت کیا ہے رونی زیادہ ہے یا ہنسی زیادہ ہے، فسادی ہے یا نیک ہے اور شکل وصورت، رنگ کیا ہے اور کیا ہوتا جا رہا ہے ....

گلے لگنے کی آرزو کے ساتھ

۴ر نومبر ۱۹۴۱ء

میری جان، پیاری۔ تمہارے دو خطوط مورخہ ۲۰، ۲۹ اکتوبر مجھے کل ملے۔ بڑے لمبے لمبے اور اچھے خط۔ جن کو پڑھ کر مجھے سخت خوشی ہوئی کہ بی بجمہ اب اچھی ہیں اور جب یہ خط پہونچے اس وقت تک تو شاید نارمل حالت پر آ جائیں۔ بیچاری بہت بیمار رہیں ان دنوں دانت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ یہ مصیبت جھیلنی پڑی۔ بنی تم اسکو اچھی طرح رکھنا اور میری طرف سے بھی جو فرائض ہیں پوری طرح انجام دیتی رہنا۔ تو میرا بخلوص تمام تم سے وعدہ ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ اکثر از حمتیں تکلیفیں اور پریشانیاں ہوں گی جان کو ہیں آزاد ہونے پر سود در سود کے ادا کر دوں گا اور تم کو اتنا پیار کروں گا کہ تم عاجز ہو جاؤ گی۔ تم اپنی طعنہ زنی سے باز نہیں آتی ہو کہتی ہو کہ دنیا میت کے فرائض مجھے ہر حالت میں بجمہ کی پرورش سے روکتے رہیں گے تم سب شریر ہو۔ اب اس خط میں ان سب باتوں کا کیا جواب دوں تم قریب ہوتیں تو بتاتا۔ لیکن قریب کیوں ہوتیں! ......

مندرجہ بالا دونوں خط ذاتی قسم کے ہیں لیکن ان میں ایک باپ کا پیار اور ایک عورت کی محبت نمایاں ہے سجاد ظہیر کی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے کیلئے یہ خطوط بطور نمونہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ سجاد ظہیر کئی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ایک ادیب ایک شاعر ایک ناول نگار اور ایک صحافی کی حیثیت سے ان کا مقام محفوظ ہے لیکن ایک خطوط نگار کی حیثیت سے انھیں اعلیٰ مقام دیا جا سکتا ہے کیونکہ اردو میں خطوط نگاری کی باضابطہ مثال نہیں ملتی۔ سجاد ظہیر کے جتنے خطوط ہیں اگر ان کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو ان کا مقام متعین کرنے کیلئے یہ خطوط کافی ہیں

ڈاکٹر اجمل اجملی

سرمدِ روزگار آں فقیرے
(نیّر بھائی کی یاد میں)

دوستوں کی محفل میں
ساتھیوں کے حلقوں میں
انجمن میں جلسوں میں
اک کمی سی رہتی ہے
تشنگی سی رہتی ہے
گیت بھی ابھرتے ہیں
لفظ بھی برستے ہیں
رات بھی مہکتی ہے
جام بھی کھنکتے ہیں
لوگ بھی بہکتے ہیں
پھر بھی حلقۂ یاراں بے مزہ سا رہتا ہے
بزمِ رفیقاں میں اک خلا سا رہتا ہے
بزمِ سرخ پوشاں میں اک کمی سی رہتی ہے
تشنگی سی رہتا ہے

— ❖ —

اک ذرا سی آہٹ پر
قافلے نگاہوں کے
سوئے در لپکتے ہیں
انتظار کی شمعیں
اس کی توقع کی ہر لمحہ میں تھرتھراتی ہیں
صرف ایک لمحے کو
جگمگا سی اٹھتی ہیں
جھلملا سی اٹھتی ہیں
اور پھر اچانک ہی سب کو یاد آتا ہے
انتظار ہے جس کا
قافلے کا وہ رہبر
انقلاب کا شہپر
آفتاب کا ہمسر
اب کبھی نہ آئے گا

— ❖ —

وہ دلوں کا شہزادہ
آبروئے عقائد کی
آرزو نگاہوں کی
جانِ محفلِ یاراں
قبلۂ گنہگاراں
لوٹ کر نہ آئے گا

— ❖ —

دار کی بلندی کو چھو کے لوٹنے والا
محبسوں کی ظلمت میں
حوصلوں کا اجالا
ذہن کے اندھیروں کو
نور بانٹنے والا
وہم کی سلاخوں کو
لب کی ایک جنبش سے پل میں کاٹنے والا
زندگی کا متوالا
موت کی ردا تانے
جامعہ کے مدفن میں سو گیا ہے نیند ایسی
شورِ صد قیامت بھی
اب جگا نہیں سکتا

ڈاکٹر قمر رئیس
صدر شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی ۔ دہلی ۔

سجاد ظہیر — اور — ترقی پسند ادبی تحریک

بیسویں صدی میں جس ادبی تحریک نے ہندوستانی ادب کا رُخ بدل دیا، اس کے آہنگ و اسلوب اور مزاج و کردار پر دُور رس [اثرا]ت ڈالے، وہ ترقی پسند تحریک ہے۔ نہ صرف اردو بلکہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی اس تحریک کو ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی [اس]کے زیرِ اثر شعر و ادب میں جو نئے رجحانات رونما ہوئے، مواد، موضوع اور تکنیک کے جو کامیاب تجربے ہوئے، ہندوستانی ادب [کی] تاریخ میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ یہ حقیقت جہاں اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستانی تہذیب اور ادب میں اس تحریک کے پروان [چڑھ]نے کے لئے حالات سازگار تھے وہاں اس بات کو فراموش کرنا بھی ممکن نہیں کہ اس تحریک کے رہنما اور معمار اعلیٰ درجے کی تنظیمی صلاحیت [کے ما]لک تھے۔ اُن میں وہ سچی لگن، ایثار و استقلال کا وہ جذبہ اور دانشمندانہ قیادت کی وہ صلاحیت موجود تھی جس کے بغیر کوئی بھی تحریک [اپ]نے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکتی

اس تحریک کے اولین معمار اور سب سے بڑے رہنما سید سجاد ظہیر تھے۔ ان کی ذہانت، بصیرت، [سنج]یدہ، انہماک اور ان کی بہترین تنظیمی اور تعمیری صلاحیت سے اس تحریک نے ہمہ گیر مقبولیت اور قوت حاصل کی۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے [کہ] ہندوستانی سماج اور تہذیب میں اس تحریک کے پنپنے اور برگ و بار لانے کے آثار و علائم پہلے سے موجود تھے۔ زمین نرم اور زرخیز تھی [اور ہو]ا سازگار تھی۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تیزی سے بدلتے ہوئے ہندوستانی سماج، انسانی رشتوں اور عوامی تحریکوں میں [اس] تحریک کی جڑوں کو ڈھونڈ نکالا۔ اور اس تحریک کا رشتہ آزادی، جمہوریت اور سماجی انصاف کیلئے ہندوستانی عوام اور ساری دنیا کے [عوا]م کی بڑھتی ہوئی جد و جہد سے جوڑا اور مضبوط بنایا۔

سجاد ظہیر نے لکھا ہے

[م]لک کے ہر ایک حصے میں ترقی پسند ادب کی تحریک ایک ناگزیر داخلی طرح نمودار ہوئی تھی

ہماری تہذیب کا ماضی اور حال اس نئے ارتقاء کا متقاضی تھا۔ ہم باہر
سے کوئی اجنبی دانہ لاکر اپنے کھیتوں میں نہیں بو رہے تھے

روشنائی صـ ۴۷

گذشتہ چالیس سال کی مدت میں یوں تو اس تحریک نے ملک کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کو متاثر کیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اردو میں اس تحریک کے اثرات کچھ زیادہ ہی وسیع اور دور رس رہے ہیں اس کا ایک سبب شاید یہ ہو کہ اردو شعر و ادب میں ظلم و جبر کی قوتوں کے خلاف بغاوت اور سماجی انصاف اور آزادی کی حمایت کو ہمیشہ ایک برگزیدہ قدر کا درجہ حاصل رہا ہے دوسرا یہ کہ پریم چند، اقبال، جوش، حسرت موہانی اور بعض دوسرے قوم پرست ادیبوں کی تخلیقات میں آزادی جمہوریت، سامراج دشمنی اور اشتراکیت کے تصورات پہلے ہی اپنی جگہ بنا چکے ہیں اور رومانی باغیانہ فکر کی ایک تو انا لہر سارے ادب میں دوڑ رہی تھی اس کے ساتھ ہی اردو میں اس تحریک کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ رہا ہے کہ اس کے سب سے بڑے رہنما سید سجاد ظہیر خود اردو کے ادیب تھے۔ اردو ادیبوں اور دانشوروں کے حلقوں میں انکی کوششیں اور سرگرمیاں زیادہ موثر ثابت ہوئیں اور اس کے لئے اردو میں اس تحریک کو نسبتاً زیادہ فروغ حاصل ہوا۔

سجاد ظہیر کی زندگی کا بیشتر اور بہترین زمانہ اسی تحریک کی تعمیر اور تہذیب میں بسر ہوا۔ انکی شخصیت متحرک روح تھی۔ ایک بار لینن کے ایک طاقتور حریف اور منشویک جماعت کے رہنما نے اعتراف کیا تھا کہ مخالف نظریہ و فکر کا مقابلہ اور ابطال تو دشوار نہیں لیکن ایک ایسے انسان (لینن) پر فتح پانا ممکن ہے جو مارکسی نظریہ و فکر کی زندہ روح ہو جو ہر لحظہ اپنے نظریہ کی ترویج و دفاع کے لئے سائنسی استدلال سے مسلح رہتا ہو۔ سجاد ظہیر بھی ترقی پسند نظریہ ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے ہمیشہ اسی طرح کمربستہ رہتے تھے۔ جو لوگ انھیں قریب سے جانتے ہیں ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ کوئی بھی صحبت یا محفل ہو وہ ترقی پسند ادب، اقدار اور آدرشوں پر بات کرتے تھے۔ فن و ادب کے ان مسائل کو چھیڑتے تھے جن پر انھوں نے ترقی پسند نگاہ سے غور و فکر کیا تھا، یا جو انھیں بے چین رکھتے تھے عالمی ادب اور انسانی تہذیب کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ قانون کی اعلیٰ تعلیم نے ان کے ذہن کو منطقی استدلال کی قوت دی تھی۔ پھر ان کے طرز گفتگو میں ایسی سادگی نرمی شائستگی اور خود اعتمادی ہوتی تھی کہ بات مخاطب کے دل میں بیٹھ جاتی تھی اکثر ان کے حریف بھی جب ان سے ملتے تھے تو ان کے نقطہ نگاہ اور خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے ان کی شخصیت، خود پسندی، خود نمائی اور ادعائیت کے اس جارحانہ احساس سے عاری تھی جو عام طور پر بڑے رہنماؤں اور دانشوروں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کو مقبول بنانے میں انکی پرخلوص اور پر وقار شخصیت کی سحر کاری اور دل داری کا بھی بڑا دخل رہا ہے

ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم کا خیال کب پیدا ہوا؟ اور کن حالات میں اس تحریک نے جنم لیا؟ اسکی تفصیلی روداد سجاد ظہیر نے اپنے مضمون یادیں ۱۹۴۰ء اور اپنی کتاب "روشنائی" میں لکھی ہے اس صدی کے چوتھے عشرہ میں وہ انگلستان میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی میں ہٹلری فاشزم کا طلوع ہماری دنیا کی امن پسند جمہوری قوتوں کے لئے ایک بھیانک خطرہ بنتا جا رہا تھا۔ جرمنی، اسپین، اطالیہ اور آسٹریا کے بعد فرانس میں بھی فاشسٹ اور رجعت پسند

طاقتیں سر اٹھا رہی تھیں عالمی معاشی بحران کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں ۱۹۳۰ء اور پھر ۱۹۳۲ء کی ستیہ گرہ کی تحریک کو بڑی بیدردی سے کچلا جا چکا تھا۔ تحریک آزادی کے کم و بیش تمام رہنما قید کئے جا چکے تھے۔ تباہ کن قوانین اور حکومت کے جبر و تشدد سے ہر طرف خوف و ہراس کی فضا طاری تھی۔ نوجوانوں میں غم و غصہ اور احساس بے چارگی نے عجیب ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی اور انگلستان میں رہنے والے ہندوستانی نوجوانوں میں بھی غلامی اور جبر و استبداد کے وحشیانہ نظام سے آزادی حاصل کرنے کے جذبات پرورش پا رہے تھے ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے لکھا ہے۔

> "ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفہ کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کے سلجھانے میں مدد دے سکے ...... مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعہ کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کر کے تمام بھی سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے۔ اسی نسبت سے ہمارے دماغ اور روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ہو جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک نئے لامتناہی تحصیل علم کی ابتدا تھی
>
> نیا ادب اور کلچر جلد ۲ نمبر ۱ ص ۲"

یہ ان کے ذہنی سفر اور اس تحریک کا نقطۂ آغاز تھا جو آج ہمارے ادبی اور ادبی تاریخ کا قابل فخر حصہ ہے

سید سجاد ظہیر ۱۹۳۱ء - ۱۹۳۲ء میں چھ ماہ کی رخصت پر ہندوستان آئے تھے یہاں ۱۹۳۲ء میں انھوں نے اپنے ہم خیال اور ہم عمر نوجوان ادیبوں کی دس کہانیوں کا مجموعہ "انگارے" کے نام سے لکھنؤ سے شائع کیا جس میں پانچ کہانیاں خود ان کی اور باقی احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کی تھیں۔ نئی نقطۂ نگاہ سے۔ یہ کہانیاں خام اور کمزور سہی لیکن ان کے ذریعہ اردو میں حقیقت نگاری کی ایک نئی روایت کی داغ بیل پڑی جو پریم چند اور سدرشن کی اصلاحی اور عینیت پسندانہ حقیقت نگاری سے بہت مختلف تھی۔ اس میں مقبول سجاد ظہیر سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان کا بے باکانہ اور باغیانہ اظہار تھا۔

اختر حسین رائے پوری نے ایک فرضی نام سے رسالہ "اردو" میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نئے رجحان کو سراہا۔ ہر چند کہ یہ کتاب قدامت پسندوں کے احتجاج پر حکومت نے ضبط کر لی لیکن اردو افسانوی ادب میں اس نے ایک نئے موڑ کی نشان دہی ضرور کی۔ اس کے اثرات خاموشی سے اپنی جگہ بناتے رہے۔ پریم چند جیسے کہنہ مشق ادیب بھی نوجوانوں کی ان سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لے رہے تھے

سجاد ظہیر اس مختصر قیام کے بعد جب لندن واپس آ گئے تو اس کتاب کی اشاعت ہی سے انھیں اس کی ضبطی سے بھی ان کے حوصلے بلند تھے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ ادیب اور دانشور بھی اپنے وطن کے مقدر کو بدلنے اور بنانے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں انھوں نے ہندوستان کے چند انقلابی نوجوانوں کے تعاون سے لندن میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک حلقہ بنایا جیسے ۱۹۳۵ء میں باضابطہ

ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن" کا نام دیا گیا اس کے جلسے پابندی سے ہونے لگے ۔ اور اس کا ایک مینی فیسٹو بھی سائیکلو اسٹائل کرا کے سجاد ظہیر نے ہندوستانی مصنفین کو بھیجا ۔ منشی پریم چند کو جب یہ مینی فیسٹو ملا تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ اسے اپنے رسالہ "ہنس" میں شائع کیا بلکہ ایک اداریہ نوٹ میں ترقی پسند مصنفین کی اس انجمن اور اس کے مقاصد کو لبیک کہا

"ہم اس تنظیم کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ زندہ و تابندہ ہو ۔ ہمیں اصل میں ایسے ہی ادب کی ضرورت ہے اور ہم نے بھی آدرش اپنے سامنے رکھا ہے "ہنس" بھی ان ہی مقاصد کیلئے جاری کیا گیا ہے !

ساہتیہ کا ادیش صفحہ ۲۵۶

اسی زمانہ میں پریم چند نے اپنی مشہور کہانی "کفن" لکھی جو دسمبر ۱۹۳۵ء کے رسالہ "جامعہ" میں شائع ہوئی ہمارے کے افسانوں میں بے لاگ اور باغیانہ حقیقت نگاری کا جو انداز سامنے آیا تھا ۔ یہ کہانی اسکی نکھری ہوئی اور فنی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ صورت تھی گویا اس طرح پریم چند نے اپنی اصلاحی اور عینیت پسندانہ حقیقت نگاری کی روایت سے خود ہی انحراف کیا تھا ۔ منشی پریم چند کی طرح ہندوستان کے دوسرے ادیبوں نے بھی تحریک اور اس کے مقاصد کی تائید کی انھیں محسوس ہوا کہ یہ ان کے دل کی ہی نہیں وقت کی آواز ہے ۔ اس سے سجاد ظہیر کو مزید حوصلہ ملا ۔ اسی زمانہ میں پیرس میں فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے نئے ادیبوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں میکسم گورکی ، رومین رولاں ، ہنری باربس اور طامس مان جیسے عالمی شہرت رکھنے والے ادیبوں نے شرکت کی ۔ اجتماع میں اس پر زور دیا گیا کہ رجعت پسند طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اور تہذیب و انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کے لئے ساری دنیا کے روشن خیال ادیبوں کو متحد اور بیدار ہو جانا چاہیئے ۔ سجاد ظہیر نے لکھا ہے کہ اس عالمی اجتماع کی کامیابیاں ان کے عزائم اور بھی بلند ہو گئے

۱۹۳۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہو کر سجاد ظہیر وطن واپس آئے تو ملک میں اس تحریک کو پھیلانے اور اسے کامیاب بنانے کا نصب العین ان کے سامنے تھا ۔ اپنے والدین کے ساتھ وہ الہ آباد میں رہنے لگے ۔ وہاں پریم چند ، احمد علی ، فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز حسین پہلے ہی اس تحریک کے ہم نوا ہو چکے تھے ۔

سجاد ظہیر ان سے ملے اور پھر مولوی عبدالحق ، جوش ملیح آبادی ، ڈاکٹر تاراچند ، رشید جہاں اور دوسرے نوجوان ادیبوں سے رابطہ قائم کیا ۔ سب نے انکی تائید کی ہمت بڑھائی ۔ وہ اس تحریک کو صرف اردو تک محدود دیکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دوسری بڑی زبانوں میں بھی اُسے فروغ دینے کی خواہش رکھتے تھے ۔ اس مقصد سے انھوں نے چند ماہ کے اندر ہندی پنجابی بنگالی اور گجراتی زبان میں کے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا ۔ وہ بڑی سرگرمی مستعدی اور مجنونانہ لگن سے کام کر رہے تھے اس تحریک کی تنظیم اور ادیبوں کے اشتراک فکر و عمل کے بارے میں بہت سے مسائل اگر ان کے ذہن میں روشن تھے تو کچھ نیم روشن اور غیر واضح بھی تھے ۔ روشنائی میں انھوں نے لکھا ہے ۔

جب ہم نے ترقی پسند ادبی تحریک کی تنظیم کی جانب قدم اٹھایا تو چند باتیں خصوصیت

تیسرا ایشیا اور چند باتیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے سامنے نظریں بیٹھی تو یہ کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب مزدوروں کسانوں اور دوسرے پسماندہ طبقوں کی طرف ہونا چاہئے۔ ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور حس حرکت جوش و عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور تمام ان آثار و رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت پسندی اور پست ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ ہمارا اولین فرض ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس عہد کے ہندوستان میں ایک ترقی پسند ادیب کا منصب کم از کم ان کے ذہن میں واضح تھا اور ان کا خیال تھا کہ ادیبوں کی تنظیم کے ذریعہ اس تصور کو زیادہ سے زیادہ ادیبوں کی تائید و حمایت حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ چند ماہ کی تیاری کے بعد انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس کا اعلان کر دیا جو اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں منعقد ہوئی اس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور اس میں حسرت موہانی، چودھری محمد علی ردولوی ڈاکٹر عبدالعلیم، احمد علی، فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی، رشید جہاں اور دوسرے نوجوان ادیبوں نے شرکت کی۔ کانفرنس عام توقعات سے زیادہ کامیاب رہی اس میں پریم چند نے جو خطبہ پڑھا وہ ترقی پسند نظریہ ادب کی وضاحت کے سلسلہ میں ان کے منشور سے بھی زیادہ جامع اور مؤثر ثابت ہوا بعد میں سجاد ظہیر نے اس کا انگریزی ترجمہ اور کانفرنس کی روداد کتابی شکل میں Towards Progressive literature کے نام سے شائع کی۔ کانفرنس میں سجاد ظہیر کو ہی اس کا جنرل سکریٹری چنا گیا تھا اس لئے انکی قراردادوں اور پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری انکی تھی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام مختلف شہروں میں انجمن کی شاخوں کا قیام تھا۔ ملک میں ادیبوں کی یہ پہلی انجمن تھی جس کی تنظیم ادب کے بارے میں کچھ واضح اور مشترک مقاصد کے تحت عمل میں آرہی تھی۔ سجاد ظہیر نے مسلسل تگ و دو کے بعد چند ماہ کے عرصہ میں الہ آباد، بنارس لکھنؤ، کانپور، علی گڈھ، پٹنہ، لاہور، دہلی اور امرت سر میں اسکی شاخیں قائم کرلیں۔ نوجوان ادیبوں کے ساتھ پریم چند جیسے بزرگ اور ادیب بھی جو اس زمانہ میں سخت علیل تھے۔ بڑی تندہی اور جوش سے تنظیمی کاموں میں سجاد ظہیر کا ہاتھ بٹا رہے تھے

> پانچ ۱ مئی ۱۹۳۶ء کے ایک خط میں پریم چند نے بنارس سے سجاد ظہیر کو لکھا تھا
> ہم نے یہاں ایک برانچ قائم کرنے کی کوشش کی ہے تم اس کے متعلق
> جتنا لٹریچر ہو، وہ سب بھیج دو۔ تو ہم یہاں سیکھوں کو ایک دن جمع کر کے
> بات چیت کروں۔ بنارس قدامت پرستی کا اڈا ہے۔ اور ہمیں شاید مخالفت
> کا بھی سامنا کرنا پڑے۔ لیکن دو چار بھلے آدمی تو مل ہی جائیں گے جو ہمارے
> ساتھ اشتراک کر سکیں پھر میں پٹنہ جاؤں گا اور وہاں ایک شاخ قائم
> کرنے کی کوشش کروں گا (روشنائی)

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب پریم چند جیسی عمر اور مرتبہ کے ادیب اس تحریک کو فروغ دینے میں ایسے والہانہ شغف سے کام کر رہے تھے تو دوسرے نوجوان ادیب کیسی لگن اور دلچسپی سے اُسے کامیاب بنانے کی کوشش کر رہے ہوں گے ایک سال بھی مشکل سے گذرا تھا کہ کرشن چندر، علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی، مجاز، جذبی، سید احتشام حسین، مخدوم محی الدین، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، کیفی اعظمی اور سبط حسن جیسے با صلاحیت ادیب اس تحریک سے متاثر ہوئے اور اس کے قریب آئے جو گاندھیائی یا قوم پرستانہ نقطہ نظر رکھتے تھے۔ مثلاً حیات اللہ انصاری، آنند نرائن ملا، غلام عباس حسینی، ساغر نظامی، علی جواد زیدی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ سجاد ظہیر کی کوشش یہ تھی، اور ان کا خیال تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے دروازے ان تمام ادیبوں کے لئے کھلے ہوں جو ملک کی آزادی، سماجی انصاف اور جمہوریت کے لئے عوام کی جدوجہد کی حمایت کرتے ہیں، جو زندگی کے بارے میں ایک واضح سائنسی اور عقلی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک اور تنظیم نے ایک متحدہ محاذ کی صورت اختیار کرلی جس میں ہر فکر و خیال اور ہر سیاسی مسلک کے ادیب شریک تھے۔ جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، رابندرناتھ ٹیگور، اچاریہ نریندر دیو، جے پرکاش نرائن مولوی عبدالحق۔ ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر ظہیر

سب کی حمایت اور سرپرستی انہیں حاصل تھی واقعہ یہ ہے کہ ان مختلف الخیال اور ممتاز دانشوروں کو ترقی پسند تحریک کے ایک فارم پر جمع کرلینا آسان نہیں تھا پھر یہ تحریک صرف اردو ہندی تک محدود نہ تھی، بنگالی گجراتی، مراٹھی تامل اور دوسری زبانوں میں بھی یہ پودا برگ و بار لا رہا تھا۔ سجاد ظہیر نے بار بار اس پر زور دیا کہ اس تحریک کا بڑا مقصد ملک کی تمام زبانوں کے عوام دوست ادیبوں کو متحد کرنا اور انہیں اس کا اہل کرانا کہ مشترک مسائل پر غور و فکر کریں گی دعوت دینا ہے ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح علاقائی اور لسانی حد بندیوں کی علیحدگی تفریق اور تعصب کا احساس کم ہوگا اور قومی ادب کو فروغ ہوگا مختلف شہروں میں انجمن کی جو شاخیں قائم ہوئی تھیں ان کے جلسوں میں مختلف زبانوں کے ادیب حصہ لیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مقصد میں انجمن کو کامیابی حاصل کامیابی ہوئی! تحریک کی ابتدائی تشکیل کے دوران سجاد ظہیر نے ایک دوسرے اہم پہلو پر بھی خاص زور دیا، وہ تھا ادب کو محنت کش عوام کی زندگی ان کے مسائل۔ انکی آرزوؤں اور حوصلوں کا ترجمان بنانا۔ ہندی اور بنگالی اور گجراتی کے بہت سے ادیب دیہاتوں اور محنت کش عوام کی صفوں سے نکل کر آئے تھے اور ان کے دکھ سکھ کی موثر ترجمانی کر رہے تھے سجاد ظہیر کی کوشش اور خواہش یہ تھی کہ اردو کے نوجوان ادیب بھی پریم چند کی طرح محنت کش عوام کی زندگی اور ان کی تحریکوں کے قریب آئیں ان کا خیال تھا کہ اردو ادب میں، جس کا بڑا سرمایہ اُمرا اور متوسط طبقہ کی تہذیبی اور جذباتی فضا کا ترجمان رہا ہے، اس طرح زیادہ وسعت، زیادہ قوت پیدا ہوگی اور اردو کی ادبی زبان عام بول چال کی زبان سے قریب آ سکیگی! سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مخدوم جیسے ادیب و شاعر، مزدوروں کی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ اس مقصد کے پیش نظر عام ادبی جلسوں کے علاوہ ایسے شہروں اور علاقوں میں بھی ترقی پسند ادیبوں کے اجتماع ہونے لگے جہاں مزدوروں کی تحریکیں زیادہ منظم تھیں، چنانچہ کلکتہ، بمبئی، احمدآباد، سورت کانپور، مالیگاؤں اور مشرقی یو-پی کے بعض علاقوں میں ترقی پسند ادیبوں کے جو اجتماع ہوئے انکی کامیابی کا ایک سبب وہاں کے محنت کش عوام کی بیداری اور انکی شرکت بھی تھی بقول سجاد ظہیر بیدار اور باشعور محنت کشوں نے ہماری ادبی تحریک کو پھیلانے اور مقبول بنانے اور اسکی پشت پناہی کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا

حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چالیس سال میں ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھوں اردو شعر و ادب کی مختلف اصناف میں جو وسعت تازگی اور رنگا رنگی پیدا ہوئی، مشاہدہ و تخیل کی جو گہرائی اور نیرنگی آئی، جو جاندار تجربے ہوئے وہ ملک کے عوام کی زندگی سے اسی قربت کا نتیجہ ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے حقیقت نگاری کا جو تصور پیش کیا اس میں زندگی اپنی ساری گہما گہمی تہداری اور تنوع کے ساتھ ایک کل کے طور پر سمٹ آئی ہے۔ اس سے اردو شعر و ادب میں نئی سمتوں اور نئے امکانات کے دروازے کھل گئے

سجاد ظہیر کی شخصیت کا جوہر اعتدال و توازن کا ایک عجیب و غریب احساس تھا عجیب اسلئے کہ وہ مارکسزم کے جس مسلک اور جس سیاسی جماعت سے وابستہ تھے اس میں سمجھوتہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر جس دور میں انھوں نے اسے قبول کیا وہ انتہاپسندی کا دور تھا اور ادب میں بھی نظری اور عملی طور پر مارکسزم کا اطلاق بہت میکانکی ڈھنگ سے کیا جاتا تھا۔ سجاد ظہیر ابتدا ہی سے افراط و تفریط سے نہ صرف خود بچے۔ بلکہ تحریک کو بھی اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی <u>۱۹۳۹ء</u> میں ہی انھوں نے ایک مضمون "اردو کی جدید انقلابی شاعری" میں ان شعراء کو ادبی دہشت انگیزی کا مرتکب قرار دیا تھا اور انکی کڑی نکتہ چینی کی تھی جو انقلاب کی ایک رومانی اور بھیانک تصویر کھینچ رہے تھے اور ایک بلند منبر پر کھڑے ہوکر مزدوروں، کسانوں اور نوجوانوں کو خطاب کر رہے تھے۔ محض اتفاق نہیں ہے کہ اس تحریک میں انتہاپسندی اور عامیت کا دور اسوقت آیا، جب سجاد ظہیر پاکستان جاچکے تھے۔ اور مئی <u>۱۹۴۹ء</u> کی بھیمڑی کانفرنس میں پہلے منشور کو رد کرکے ایک نیا منشور منظور کیا گیا جس کے نتیجہ میں ترقی پسند ادیبوں میں باہمی اختلافات، ادعائیت، انتشار اور کم نگاہی کی ایسی فضا پیدا ہوئی جس سے تحریک کو نقصان پہنچا اگر سجاد ظہیر ہندوستان میں ہوتے توکم ازکم ادبی سطح پر دارو گیر کی وہ صورت نہ پیدا ہوتی

مارکسی ہونے کے باوجود سجاد ظہیر کا نظریۂ ادب اس تنگ نظری اور انتہا پسندی سے پاک تھا جو اس دور کے بعض دوسرے مارکسی نقادوں کی تحریروں میں نظر آتا ہے وہ قدیم کلاسیکی ادب یا علامتی اور غنائی شعر و ادب کو محض جاگیردارانہ یا بورژوا مذاق و فکر کا کرشمہ کہہ کر رد نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے اعلیٰ نمونوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ صرف مواد، موضوع یا انقلابی فکر پر نہیں تکنیک، فن، زبان و بیان کی لطافتوں پر بھی یکساں نظر رکھتے تھے!

وہ روشنائی میں ایک موقع پر لکھتے ہیں

"ہماری تحریک کے پھیلاؤ اور عوام سے ہماری بڑھتی ہوئی قربت اور ان سے براہ راست تعلق کے پیش نظر اب یہ اور بھی ضروری ہوگیا تھا کہ نئے حالات میں ترقی پسند ادب کے تمام تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کیلئے فن اور تکنیک کے مسائل پر مسلسل غور و فکر کیا جائے تنقید بہتر ہو زبان و بیان پر عبور حاصل کرنے کی سعی کی جائے ہمارے مبلغ علم میں اضافہ ہو اور پیہم مشق اور تجربے کے ذریعے اپنی خامیاں اور کمزوریاں دور کرکے ادبی تخلیق کی تمام اصناف کی سطح کو بلند اور معیار کو اونچا کرنے کی کوشش برابر جاری ہے!

ترقی پسند ادیبوں کے ایک اجتماع میں جب مولانا حسرت موہانی نے اپنی غزل کی شاعری کو ہوسناکی کی شاعری قرار دیا اور کہا کہ ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات سنجیدہ اور بلند مقاصد کی ترجمان ہوں تو سجاد ظہیر نے انکی رائے سے اختلاف کیا اور لکھا کہ ہمیں غزل کی شاعری، غنائی شاعری کی بھی ضرورت ہے۔ شعر و ادب کے بارے میں ان کے اس لچک مند اور متوازن رویے کا مطالعہ انکی قابل قدر کتاب "ذکر حافظ" اور مضمون "اردو غزل" میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

سجاد ظہیر کی وسیع المشربی اور بلند خیالی اپنی جگہ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تحریک کے بنیادی مقاصد کا سودا یا رجعت پسند خیالات سے سمجھوتہ کر سکتے تھے۔ جب اثر لکھنوی، ماہر القادری، خواجہ شفیع اور دوسرے بزرگ ادیبوں نے ترقی پسند ادب اور نظریۂ ادب پر حملہ کیا تو انھوں نے مدلل طریقے سے ان کے اعتراضات کا جواب دیا۔

اپنے مختلف مضامین میں انھوں نے نہ صرف زندگی تہذیب اور ادب کے بارے میں ترقی پسند نظریات کی وضاحت کی بلکہ ان رجعت پسند اور عوام دشمن خیالات اور رجحانات کو بھی بے نقاب کیا جو دبے پاؤں آنتے یا لائے جاتے ہیں انھیں احساس تھا کہ قدامت پسندوں یا تحریک کے مخالفوں کے پاس نشر و اشاعت کے بہتر ذرائع ہیں اس لئے ترقی پسند ادب اور ادبی تصورات کی اشاعت کے لئے انھوں نے اشاعتی اداروں کے قیام اور ترقی پسند رسالوں کے اجراء پر بھی بہت زور دیا ان ہی کوششوں سے لکھنو میں حلقہ ادب کے نام سے ترقی پسندوں کا اشاعت گھر قائم ہوا

ترقی پسند تحریک کے آغاز و ارتقا کا زمانہ ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور اردو ہندی کی بڑھتی ہوئی چشمک اور نزاع کا دور تھا۔ علاقائی، فرقہ وارانہ اور لسانی تنگ نظری اور عصبیت سے سجاد ظہیر سخت برہم اور بیزار رہتے تھے انھوں نے کوشش کی کہ ان مسائل کے بارے میں ادیبوں کا ذہن صاف ہو اور اس کا زہر ادب میں نہ پھیلے ملک کی قومی زبانوں خاص طور سے اردو ہندی کے مسئلہ پر وہ ایک وسیع علمی اور عوامی نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کرتے تھے جس کا ثبوت اردو ہندی اور ہندوستانی کے مسئلہ پر ان کا وہ منتخب خطبہ ہے جو ۱۹۴۵ء کی حیدرآباد کانفرنس میں انھوں نے پڑھا تھا۔ مہاتما گاندھی اور پریم چند کی طرح وہ بھی مستقبل کے ہندوستان میں ہندوستانی کو کل ہند رابطہ کی زبان بنانے کے حامی تھے۔ لیکن اس سلسلہ میں وہ کسی جبر کے قائل نہ تھے ان کا خیال تھا کہ جب تک اردو ہندی ایک دوسرے کے قریب آکر بالکل ایک زبان کا روپ نہ اختیار کرلیں تعلیم اور حکومت کے کاموں میں دونوں کو مساوی درجہ دیا جائے۔

تحریک کے بعض دوسرے ممتاز اراکین مثلاً رام بلاس شرما، ملک راج آنند اور سید احتشام حسین نے بھی ملک کے

لسانی مسائل، خاص طور سے اردو ہندی کے بارے میں علمی معروضیت اور عوامی نقطۂ نگاہ سے لکھا ان کے عقلی اور واضح نقطۂ نگاہ سے لسانی تعصب اور تنگ نظری کی طاقتوں کو صدمہ پہونچا۔ آزادی کے بعد اگر ملک کے لسانی مسائل کو سلجھانے میں سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند دانشوروں کے نقطۂ نگاہ کا احترام کیا جاتا تو کم از کم اردو اس کسمپرسی کا شکار نہ ہوتی

سجاد ظہیر کا ایک بڑا کارنامہ اردو میں اور ملک کی دوسری زبانوں میں بین الاقوامیت کے احساس و تفکر کی اشاعت ہے۔ انھوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ نوجوان ادیب نہ صرف یہ کہ دنیا کے محنت کش عوام کی انقلابی جد وجہد سے بلکہ دنیا کے ترقی یافتہ زبانوں کے ادبی رجحانات اور بلند پایہ انقلابی تخلیقات سے بھی روشناس ہوں، جدید فرانسیسی شعرا اور "لوئی ارا گاں" کے عنوان سے انھوں نے جو مقالے لکھے ان میں فرانسیسی شاعری کے نئے رجحانات اور لوئی ارا گاں کی انقلابی فکر و تخیل کا بڑی خوبی سے مطالعہ کیا۔ دوسرے نوجوان ترقی پسند ادیبوں سے بھی انھوں نے ایسے ہی موضوعات پر مضامین لکھوائے اور ترجمے کرائے

دوسری طرف انھوں نے اردو کے با صلاحیت ترقی پسند ادیبوں کو سوویت یونین اور دوسرے اشتراکی ملکوں میں روشناس کرایا اور ان کی تصانیف کے ترجموں کی سفارش کی تاشقند اور سوویت یونین میں کئی بار مجھے سوویت ادیبوں سے ان کی ملاقاتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا اور کبھی کبھی ترجمان کے فرائض بھی انجام دینا پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت کھلے دل سے اور کبھی کبھی مبالغہ کے ساتھ اپنے ترقی پسند ادیبوں کو سراہتے ہیں۔ اکثر ادیبوں میں معاصرین سے چشمک یا کینہ اور حسد کی جو خاصیت ہوتی ہے وہ بعض ادیبوں مثلاً کرشن چندر اور فیض احمد فیض کو وہ زیادہ عزیز رکھتے تھے شاید اس کا سبب بھی یہ تھا کہ انھوں نے زندگی اور ادب کے ترقی پسند نظریہ و اقدار سے زیادہ سے زیادہ استقلال کے ساتھ وفاداری برتی

ایک بار کہنے لگے کہ پاکستان میں پارٹی کے تنظیمی کاموں کے دوران میں نے پارٹی کی رکنیت چاہنے والے نوجوانوں سے ایک سوال نامہ پُر کرایا جس میں ایک کالم یہ بھی تھا کہ کس طرح کے محرکات انھیں اشتراکی نظریات کے قریب لائے مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ بیشتر نوجوانوں نے کرشن چندر کی تصانیف کو اپنی اشتراکیت دوستی کا اصل محرک قرار دیا تھا۔

پاکستان کے زمانہ قیام میں اگرچہ اُن کا زیادہ وقت سیاسی کاموں میں اور روپوشی یا قید و بند میں گذرا لیکن وہاں بھی اپنی تصنیف "روشنائی" مکمل کرکے انھوں نے اس تحریک کی گرانقدر خدمت انجام دی

"روشنائی" دراصل ۱۹۴۷ء تک اس تحریک کے نشیب و فراز کی تاریخ ہے اس کے علاوہ وہاں سے انھوں نے جو خطوط لکھے ان میں ترقی پسند ادیبوں کے نگارشات پر جو تبصرے کیے، انقلابی ادیب کے کردار اور منصب کا جو بلند آدرش پیش کیا وہ بھی اس تحریک سے انکی بے مثل وفاداری کا ثبوت ہیں

ہندوستان واپس آنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ اگرچہ ترقی پسند ادیبوں کے فن میں اب زیادہ پختگی اور گہرائی پیدا ہوگئی ہے اور ترقی پسندی کے آدرش ہمارے تخلیقی ادب کی شریانوں میں گرم خون کی طرح رواں دواں ہیں، تاہم اسکی تنظیم کا شیرازہ بکھر گیا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اب اس تحریک کو باضابطہ تنظیم کی ضرورت نہیں۔ لیکن ۱۹۶۲ء میں جب انھوں نے محسوس کیا کہ ملک کے سیاسی اور سماجی نظام کی طرح ادب میں رجعت پسند طاقتوں کا نفوذ و اثر بڑھ رہا ہے، نوجوان ادیب بے یقینی، بے زاری، بے حسی اور خود پرستی کا شکار ہیں ملک کے اور ساری دنیا کے بدلے ہوئے حالات دانشوروں کو نئے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں تو دسمبر ۱۹۶۶ء میں آخری بار انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کی ایک کل ہند کانفرنس بلائی جو مباحثوں اور مذاکروں کی گرمی اور دلچسپی کے لحاظ سے بے حد کامیاب رہی اس میں انجمن کا ایک نیا دستور اور منشور منظور کیا گیا جس کے مطابق ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو ایک غیر الحاقی اور مرکزی تنظیم کی صورت دی گئی ٭

اس دوران سجاد ظہیر ترقی پسند ادیبوں کی عالمی تحریک، خاص طور پر ایفرو ایشیائی ادیبوں کی تحریک میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے اس کے اجتماعوں میں مقالے پڑھے اور اسکی تنظیم کو مضبوط بنایا وہ سامراجی غلامی اور ہر طرح کے استحصال سے اقوام عالم کی نجات اور آزادی کے علمبردار تھے اور ہر اس تحریک کے حامی جو اس بلند مقصد کے حصول میں مدد کرتی ہو

سجاد ظہیر بے مثل تنظیمی صلاحیت ذہانت اور اعلیٰ درجہ کی تخلیقی قوت کے مالک تھے۔ ان کی تصنیفی زندگی کے اولین نقوش۔ انگارے۔ کے افسانے اور ناولٹ، لندن کی ایک رات شاہد ہیں کہ اگر وہ تخلیقی کام جاری رکھتے تو بلاشبہ آج ہندوستانی ادب میں صف اول کے فن کار ہوتے انکے تنقیدی مضامین کبھی ذوق ادب کی پختگی فکر و نظر کی گہرائی اور اعلیٰ تنقیدی شعور کے گواہ ہیں انکی نثر میں ہر جگہ اظہار و اسلوب کی سادگی، پرکاری، شگفتگی، علمیت اور فطری ذہانت کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں

اُن کی تصانیف اور تحریروں کا سرمایہ کتنا ہی محدود اور مختصر سہی، اردو ادب میں انکی بقا کا ضامن ہے لیکن فی الحقیقت ان کا عظیم کارنامہ ہندوستانی ادب میں اس صدی کی سب سے بڑی تحریک کی قیادت ہے تحریک جو ہندوستانی ادب کی تاریخ کا ایک اہم نشان باب ہے ایسے عہد آفریں دانشور صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں

بقیہ فراق گورکھپوری سے انٹرویو

ہندوستانی اور ایک بہت اچھا دوست اور Born and highly gifted leader

اب ہمارے درمیان نہیں رہا !

باتیں تو شاید کچھ اور بھی ہو سکتی تھیں لیکن اب میں ان کو زحمت دینا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا کیونکہ وہ ایک سی کی جگہ بستر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے !

(علی احمد فاطمی)

اگر کنبہ چھوٹا ہو تو والدین ہر بچّے پر زیادہ توجّہ دے سکتے ہیں اور اسے زندگی کی زیادہ سہولتیں مہیا کر سکتے ہیں۔ اس سے ملک کو بھی بحیثیت مجموعی اپنے وسائل کے بہتر استعمال کا موقع ملتا ہے۔

فیملی پلاننگ ہماری قومی ترقی کے پروگرام کا ایک لازمی جزو ہے اور ہم نے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے تمام ذرائع کو بروئے کار لانے کا تہیّہ کر رکھا ہے۔



اندرا گاندھی

davp 75/596

بھیشم ساہنی
مترجم
عبدالحمید ایم اے

بنّے بھائی

ہندی ادب کے نامور دانشور اور ادیب جناب بھیشم ساہنی نے ہماری درخواست پر مقالہ سید سجاد ظہیر نمبر کے لئے ہندی زبان میں تحریر فرمایا ہے اس مقالہ کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے — ادارہ

ادب کی تاریخ میں جہاں عام طور پر ادیب اپنی تصانیف کی بدولت جانے جاتے ہیں۔ وہاں کچھ ایسے نام بھی اُبھر آتے ہیں جو اپنی تصانیف کے علاوہ عرفانی نگاہ اور اپنی شخصیت کی بدولت شہرت حاصل کرتے ہیں ادب کو انکی شخصیت کی دین اتنی ہی گہری اور بیش قیمت ہوتی ہے جتنی انکی تصانیف کی۔ کوئی مفکر یا ادیب اپنی سوجھ بوجھ اور دوربینی کے خطوط پہ ادب کو ایک نیا موڑ دے جاتا ہے نئی سمت اور نئی نگاہ دے جاتا ہے۔ بھلے ہی وہ آدمی اپنے قلم سے زیادہ نہ لکھ پایا ہو وہ سوجھ بوجھ اور نظر اسکی زندگی بھر کی سرگرمیوں سے جھلکتی ہے۔ اسکی ڈائری سے، اسکے خطوط سے ان رپورٹوں اور مضامین سے جو وقتاً فوقتاً وہ پیش کرتا رہا ہے

اس سوجھ بوجھ کے علاوہ اسکی ایک بااثر اور دلکش ہوئی شخصیت بھی ہوتی ہے جس سے انسانی ہمدردی حب الوطنی، زندگی میں یقین اور انسانیت کی کرنیں پھوٹتی ہیں جن سے انکی سوجھ نگاہ اور زیادہ پر اثر اور پرکشش بن جاتی ہے

میری نظر میں سجاد ظہیر ایسے ہی ایک ادیب تھے یہی وجہ ہے کہ پچھلے چالیس سال کے ہندوستانی ادب پر نظر ڈالتے ہوئے ہم انھیں ترقی کے ہر قدم پر موجود پاتے ہیں پچھلے چالیس سال ہمارے ادب کی تاریخ میں بہت اہم رہے ہیں اس میں بہت خوبصورت شاہکاروں سے ہمارے دیش کے ادب کو باعظمت بنا دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان خوبصورت تصانیف کے بیشتر مصنف اس ادبی تحریک کے ساتھ یا تو پوری طرح جڑے ہوئے تھے جس کے خاص محرک اور رہبر سید سجاد ظہیر تھے

انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں پہ نظر ڈالیں تو بہت سی باتوں کی طرف دھیان جاتا ہے۔ پہلے جلسہ کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ ایسا ہے سب ہی تھا۔ اسی وقت پنڈت جواہر لال نہرو نے اس انجمن کے مخصوص نظریہ کی تعریف کی تھی اور اسکی تائید کی تھی۔ دوسال بعد رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی نیک خواہشات کے پیغام میں اس تحریک کی خوبیوں کا ذکر کیا جو لوگوں کی زندگی کے ساتھ گہرائی میں جڑنے پر پیدا ہوتی ہے جیسے عوامی زندگی کے دُکھ سکھ اچھوتے طور کے چشمے پھوٹتے ہیں اور دھیرے دھیرے ملک کے مشہور و مخصوص ادیب اور مفکر اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کے ذریعہ چلائی گئی اس ادبی تحریک کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ اس میں اپنے دیس اور وقت کی سوجھ تھی وہ ادیب کو اس زمانہ کے ساتھ جوڑتا تھا، اسکے سماج کے ساتھ عوامی زندگی کے ساتھ جوڑتا تھا اس نے ادیب کو متاثر کیا کہ وہ اسی عوامی و سماجی زندگی کے دل کی دھڑکنیں سنیں انھیں پہچانے اور سمجھے اور اپنے دکھ درد کو عوامی زندگی سے جوڑ دے۔ یہی وجہ تھی کہ اس تاثر کے زیر اثر ہمارا ادیب اس عظیم انقلاب کے ساتھ از خود

جڑ جاتا تھا جو ملک کی آزادی کے لئے چلایا جا رہا تھا ۔ اس ادبی انقلاب کی یہی خاص دین تھی کہ ادیب سماج سے الگ نہیں رہ سکتا، سماج کا درد اس کا اپنا درد ہے ۔ سماج کی لڑائی کی سمت اس کے ادب کی بھی سمت بن جاتی ہے

یہ نکتہ جس پر سجاد ظہیر نے زور دیا، اپنے میں نیا نہیں تھا ہمارے بہت سے ادیب بھی طور پر اسی لہر کے ساتھ لکھ رہے تھے ، سجاد ظہیر نے اسے ایک اجتماعی ادبی سمت کے روپ میں پیش کیا، اسے ایک اسٹیج دیا اسے ایک آواز دی جس سے یہ عظیم الشان اسٹینڈ پوائنٹ پر ادب اور سماج بھی اپنی ذمہ داری ادا کر سکے

یہی عظیم نظریہ ادب کے دوسرے پہلوؤں کو بھی روشن کرتا ہے ۔ ایک طرف دیس کی عظیم صحت مند روایات سے ادیب کو جوڑتا ہے ۔ اسکی انسان نوازی سے اور گہرے انسانی خیالات سے ۔ دوسری جانب حال کی اس جنگ کے ساتھ جوڑتا ہے جو ایک سنئے سماج اور ایک نئی تہذیب کے لئے لڑی جا رہی ہے ۔ یہ تنگ نظر نہ ہو کر وسیع النظر ہے ۔ روایات سے چلی آ رہی انسانیت کی گہری، صاف دھارا کو ہی زیادہ وسیع اور زیادہ صحیح با مقصد سمت دیتا ہے ۔ جس تحریک کے سید سجاد ظہیر روح رواں تھے اسکی شکل کو اگر ہم دھیان سے دیکھیں تو ہم پائیں گے کہ وہ ایک وسیع انسانی اسٹیج رہا ہے جس میں مختلف خیالات روایات، و نظریات کے لوگ ایک ساتھ مقصد کو یکجا اکٹھے ہوتے ہیں اس میں گاندھی وادی بھی ہیں اور مارکس وادی بھی انھیں جوڑنے والا مقصد ایک ہے کہ وہ انسانی زندگی کی امیدوں اور تمناؤں کو صدا دینے کے ساتھ ساتھ ان سبھی عناصر کی تائید کریں ۔ جو اس انسانی زندگی کو آگے لے چلنے والے ہوں اور ان عناصر کی مخالفت کریں جو اس انسانی زندگی کو ختم کرنے والے ہوں ۔ برٹش سرکار کی مخالفت کے علاوہ جسے ہمارے سماج کی گراوٹ کی خاص وجہ مانا جاتا ہے ، اس ایجنٹ نے مذہب پرستی ، فرقہ وارانہ ذات پات اور تمام ایسی برائیوں اور برسی رسموں کی مخالفت کی جو سماج کی ترقی میں رکاوٹ بنتی تھی پر ساتھ ہی ساتھ اس تحریک میں سبھی آگے رہ کر ان عناصر کی بھرپور حمایت کی جو سماج کو آگے لے جانے والے تھے ایک انصاف پسند سماج کے قیام کیلئے جدوجہد کرتے تھے

سجاد ظہیر کی سوجھ اور دور بینی اس میں تھی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذریعہ انھوں نے ہمارے ادب کو ایک صاف سمت دی اور ادیب کے سامنے ایک ایسا راستہ پیش کیا جو تنگ نہ ہو کر وسیع تھا، جو خود میں محدود نہ ہو کر عوام میں محدود تھا ، جو خیالات کی اڑانوں اور نجی سنک پر مبنی نہ ہو کر سماجی حقیقت اور اس کے سائنسی علم پر مبنی تھا جو صرف تفریح اور دل بہلانے کا ذریعہ نہ بن کر زندگی کی جدوجہد میں انسان کا سہارا بنتا تھا جس میں یقین ، انسان کی جدوجہد اور اس کے نظریہ میں گہرا یقین، زندگی کے لئے گہری محبت اور گہری انسانیت پائی جاتی تھی یہ زاویہ نظر اس تحریک نے دی جس کے رہبر سجاد ظہیر تھے ۔ یہ نظر بندھن توڑنے والی نظر تھی ادیب کا تصور اظرف کے سامنے نئی نسیم کھولتا تھا

کیا یہ مہم ایک چھوٹی مہم تھی ؟ سجاد ظہیر نے دیش کی ادبی سرگرمیوں کو ایک ٹھوس شکل دی تھی اور ایک روشن سمت دی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نام اور انکی دین آج بھی انکی اہم ذمہ داری کو نبھا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہم انھیں گہری عقیدت اور محبت سے یاد کرتے ہیں !

اس گہری سوجھ بوجھ کے علاوہ سجاد ظہیر ایک پیاری شخصیت کے مالک تھے ، خاکساری خادم ، ملنساری ، دوست پروری اور سادگی انکی خوبیاں تھیں جو انسان ۔ کسی عقیدے پر اپنا ساری زندگی نچھاور کر دیتا ہو اسکی شخصیت میں ایک طرح کا نکھار آ جاتا ہے سجاد ظہیر کی شخصیت میں بھی ایسا ہی نکھار پایا جاتا تھا ۔ انکی شخصیت سے پیار اور خوشی پھوٹتی تھی جو لوگوں کو باندھ لیتے تھے یہ ممکن نہیں تھا کہ سجاد ظہیر کوئی مانگ لیکر کسی کے ساتھ جائیں اور وہ انکار کر دے ۔ ادبی تحریک سے جڑنا ان کے لئے ملک کی عظیم جدوجہد سے جڑنا تھا اور جب کبھی ملک پر کسی قسم کی مصیبت آئی سجاد ظہیر نے تن من سے عوام کی خدمت کے لئے کام کیا

۱۹۵۲ء میں شاید میں نے پہلی بار انھیں دیکھا تھا حالانکہ ان کا نام میں برسوں پہلے سنتا آ رہا تھا۔ ان دنوں حال ہی میں بنے بھائی پاکستان سے رہا ہو کر آئے تھے۔ پاکستان میں وہ بہت دنوں تک جیل میں رہے تھے ان پر سازش کا مقدمہ چلایا گیا تھا اور ان کی جان کا خطرہ بنا رہا تھا انھوں نے اپنے کوٹ کے کالر پر ایک کاغذ پن کر رکھا تھا جس پر اپنا نام لکھ دیا تھا۔ سجاد ظہیر۔ اس خیال سے کہ ایک ایک آدمی سے اپنا تعارف نہ کروانا پڑے۔ دور سے ہی لوگوں کو پتہ چل جائے کہ سجاد ظہیر یہاں موجود ہیں۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس ہوا تھا جو کوئی ان کا نام پڑھتا لپک کر ان سے بغلگیر ہو جاتا۔ لوگوں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ ہر واقف ناواقف ان سے بات کرنا چاہتا تھا کچھ لوگ یوں ہی انھیں گھیرے ہوئے تھے اور ان کی طرف دیکھے جا رہے تھے اور جلسے کا کام پیچھے پڑتا جا رہا تھا۔ ہر کوئی انھیں اپنا مانتا تھا۔

یہ ۱۹۵۳ء کے آس پاس کی بات ہے اس وقت تک انجمن ترقی پسند مصنفین میں انھیں کام کرتے بیس برس بیت چکے تھے۔ انکا انتقال ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ تب بھی وہ انجمن ترقی پسند مصنفین میں سرگرم عمل تھے اس کے کرتا دھرتا تھے اور افرو ایشیائی ادبی کانفرنس میں ہندوستانی ادیبوں کی رہبری کرتے تھے۔ وہیں پر ان کو دل کا دورہ پڑا تھا وہ اسپتال میں لے جائے گئے اور وہیں پر انکی موت ہوئی۔ زندگی کی آخری گھڑیوں تک وہ اس تحریک سے جڑے رہے اور تا حیات اس کوشش میں لگے رہے کہ ہندوستان کے ادیب آج کی دنیا کو سمجھیں اور جانیں سماج میں اپنے مقام کو پہچانیں اور اپنے لوگوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالیں۔ وہ سماج کو بدلنے والی طاقت بنیں۔ سجاد ظہیر ولایت میں پڑھے تھے لیکن جدید ادب کی مخالفت میں قلم اٹھایا تھا جو ولایت سے ہی نکلنے لگا تھا۔ وہ امیر گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے ماں باپ دولت مند اور اونچے رتبہ والے تھے لیکن سجاد ظہیر آرام و آسائش کو لات مار کر گھر سے باہر نکل آئے تھے اور اپنا ناتہ دیش کے غریب عوام سے جوڑا تھا۔ وہ ایسے ماحول میں رہ چکے تھے جب فرقہ واریت کا زہر ملک کی نس نس میں پھیل رہا تھا لیکن انھوں نے تمام عمر فرقہ واریت کی سخت مخالفت کی اور دل زبان اور کام سے سیکولرازم کا نمونہ بن کر جیے۔

یہی وجہ ہے کہ آج ان کے چلے جانے کے بعد بھی جگہ جگہ سے ہمیں خطوط ملتے ہیں، کبھی بنگلور سے تو کبھی دہرہ دون سے، تو کبھی کلکتہ سے جن میں ادیب ان کے واقعات کا حوالہ دیتے ہیں ان کے ساتھ ہوئی اپنی بات چیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمیں طرح طرح کے مشورے بھیجتے ہیں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کو اس طور پر سرگرم عمل ہونا چاہیے، ترقی پسند مصنفین آج بھی بنے بھائی کی سب سے بڑی دین ہے!

قومی سطح پر کھڑا کیا گیا وہ اسٹیج جس پر ملک کی زبانوں کے ادیب پوری برابری کے ساتھ اپنے سماج اور ادب کی الجھنوں پر خیال کر سکتے ہیں اس اسٹیج کو جدید اور سرگرم بنانا ہی ان کے تئیں سب سے بڑا خراج عقیدت ہوگا

سید سجاد ظہیر اپنی تحریک سے زیادہ عظیم تھے

فراق گورکھپوری سے ایک انٹرویو

محترم پیام صاحب

فراق صاحب سے ایک انٹرویو لیکر آپکی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں امید ہے یہ آپ کے نمبر کی زینت میں اضافہ کرے گا بعض باتیں فراق صاحب کی ایسی ہیں جن سے سخت اختلاف کیا جاسکتا ہے اور بعض باتوں کو مجھے اس انٹرویو میں نہیں لکھنا چاہیے تھا لیکن میں نے خاص طور پر لکھیں تاکہ فراق صاحب کے خیالات کے بارے میں تمام قارئین کو علم ہوسکے

اگر آپ نوٹ کے ساتھ یہ خط بھی شائع بھی فرمادیں تو میں اس کا ممنون ہوں گا

: احقر علی احمد فاطمی

فراق گورکھپوری سے انٹرویو لینے جب میں ان کے دولت کدہ پہ پہونچا تو خلاف امید اس دن وہ کچھ زیادہ ہی بشاش نظر آرہے تھے مجھے قدرے تسکین ہوئی کیونکہ فراق صاحب سے اس طرح کی باتیں کرنے کیلئے ان کے موڈ کو دیکھنا اور پھر اس کو بنانا پڑتا ہے اس کامیابی کا انحصار انٹرویو لینے والے پر ہے ۔ وہ گدے دار کرسی پہ دراز تھے کنگ سائز سگریٹ ان کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا اور ایک خاص ادا میں وہ اس کا دھواں چھت کی طرف اڑا رہے تھے ، آداب عرض ہے حضور!

۔ کون ہے بھئی ۔ ؟ ان کی بجھی بجھی گول آنکھیں گھوم گئیں

" میں ہوں فاطمی ۔

۔ کون ہے آدمی ۔ بھئی آدمی تو سبھی ہیں ۔ آدمی کون ؟ " وہ قدرے تیز لہجے میں بولے

۔ میں علی احمد فاطمی ہوں فراق صاحب!

" اچھا ۔ اچھا ۔ آؤ کہاں رہے مولانا ۔ ؟

اور اس کے بعد حسب عادت انھوں نے شعبۂ اردو کی خیریت پوچھی ۔ یونیورسٹی کا حال جانا اور پھر ادھر ادھر کی باتوں میں گم ہو گئے پنکھا ان کے سر پہ ناچ رہا تھا ۔ اخبار زانو پہ پھیلا ہوا تھا ۔ چائے کی پیالی میز پر رکھی ہوئی تھی جس میں بغیر دودھ کی لیمو کی چائے جو بہت خوش

رنگ نظر آرہی تھی۔ ہر دو منٹ بعد وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کو اٹھاتے اور چھوٹا سا گھونٹ حلق میں انڈیل کر پھر اسے میز پر رکھ دیتے۔ میں نے جب ماحول خوشگوار پایا تو مقصد کی طرف رجوع ہوتے ہوئے بات چھیڑ دی

حضور —! میں آپ سے سجاد ظہیر صاحب کے سلسلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو

• کیوں بھئی خیریت تو ہے تمہارا موضوع تو یہ نہیں — کیا ریسرچ کا موضوع بدل دیا ہے؟

• نہیں — نہیں بات دراصل یہ ہے کہ سجاد ظہیر صاحب کے سلسلے میں "گنگ و جمن" کا ایک نمبر آرہا ہے۔ پیام فتحپوری صاحب نکال رہے ہیں۔ پیام صاحب سے تو آپ واقف ہیں کا پنور سے تعلق ہے!

• ہاں ہاں" پیام کو جانتا ہوں بھئی۔ آتے جاتے رہتے ہیں

• میں آپ سے سجاد ظہیر صاحب سے متعلق کچھ تاثرات جاننا چاہتا ہوں!

• اب یاد رفتگاں کی بھی طاقت نہیں رہی — اسی سال کا ہو گیا ہوں میرا بھائی تو کچھ سال پہلے ہی چل بسا دوسرا بھائی بھی بیمار چل رہا ہے" انھوں نے یہ جملے بڑے دکھ کے ساتھ ادا کئے اور پھر بول پڑے "سجاد ظہیر سر وزیر حسن کے لڑکے تھے اور الہ آباد کے مشاہیر میں ان کا شمار تھا ہم لوگوں کے یہاں سے آمد و رفت تھی۔ بس انھیں کے ذریعہ سجاد ظہیر سے ملاقات ہوئی۔ شروع شروع میں سجاد ظہیر سے کم ان کے دوسرے بھائیوں سے زیادہ اچھے تعلقات تھے لیکن رفتہ رفتہ میں اپنے آپ یہ محسوس کرنے لگا کہ میرا ذہن جھکاؤ سجاد ظہیر کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ اور بعد میں تو سجاد ظہیر سے ایسے گہرے تعلقات ہو گئے کہ جن کو میں آخیر وقت تک اپنے کلیجہ کا ٹکڑا سمجھتا رہا۔ بڑا افسوس ہوا مجھے ان کے انتقال کا۔"

س۔ • جی ہاں سجاد ظہیر کا انتقال یقیناً ایک سانحہ تھا۔ آپ کو سجاد ظہیر صاحب میں کیا پسند آیا، ان کی شخصیت یا انکی تحریر —؟

کانپتے ہوئے ہاتھ چائے کی پیالی کی طرف بڑھے چائے تھرتھرا اٹھی آخری گھونٹ ان کے حلق میں جا پہنچا سگریٹ بجھ چکی تھی انھوں نے اس کو دوبارہ جلایا اور ایک طویل کش فضا میں بکھر گیا

ج • سجاد ظہیر کی شخصیت ان کی تمام چیزوں پر بھاری تھی۔ تحریر کو اگر ہم ان کے سیاسی کارناموں کے مقابلوں میں تولیں تو مجھے انکی تحریر میں زیادہ دلکشی نظر آتی ہے۔ لیکن انکی شخصیت سب سے اہم ہے۔ ظہیر میں ایک عجیب سی مقناطیسی کشش تھی، اتنا پیار، اتنا خلوص، اتنی سکراہٹ آج تک میں نے کسی کے چہرے پر نہیں دیکھی۔ ایک عجیب شکل میں لوگ ان کے بارے میں محسوس کرتے تھے اور سوچتے کہ کیا دلکش چیز ہے یہ سجاد ظہیر بھی — سجاد ظہیر نے اگرچہ لکھنے پر زیادہ زور نہ دیا مگر انکی تحریر زیادہ پسند ہے — سجاد ظہیر ایک نہ تھے بلکہ دو تھے — پہلے LOVER — دوسرے WORKER — LOVER وہ لٹریچر کی حیثیت سے زیادہ رہے اور WORKER وہ عوام میں رہے

س : فراق صاحب —! جب آپ انکی تحریر کو اس قدر پسند کرتے ہیں تو آپکو انکی تخلیقات میں سب سے زیادہ کیا چیز پسند آئی —

ج — حافظ پر ان کی کتاب میرے خیال میں سب سے اچھی ہے جو انکی شعر فہمی اور سخن فہمی صلاحیتوں کی زبردست مثال ہے۔

انھوں نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا

س :۔ ایک بات میں اسی سلسلہ میں آپ سے اور دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ نے شعر فہمی اور سخن فہمی کی صلاحیت کو تسلیم کیا ہے تو آپکی شاعری کے بارے میں کبھی سجاد ظہیر صاحب نے اپنی ناقدانہ رائے اپنی تحریر میں یا تقریر میں یا آپ سے خود کبھی زبانی بات چیت کی ہے"

شاید یہ سوال دلچسپ تھا۔ فراق صاحب قدرے متفکر ہوئے، گردن کو موڑا اور آنکھوں پر اس قدر زور دینے لگے جیسے قوت

حافظ اُن کی آنکھوں میں مسکراہٹ آئی ہے پھر بڑی سنجیدگی سے گویا ہوئے

ج ! مجھے اپنی زندگی بھر میں اپنی شاعری کا اتنا بڑا قدر شناس اور قدردان شاید دو ایک ہی ملے ہوں جتنے بڑے قدردان سجاد ظہیر تھے ۔ میرے مصرعہ کو ایک بار میرے ہی اوپر چپاں کر دیا

" میں ایسا وقت ہوں جس کا کبھی گھٹنا نہیں ممکن

" اور سجاد ظہیر نے اپنے اخبار میں لکھا تھا " فراقؔ تم ایسے وقت ہو جس کا گھٹنا ممکن نہیں " سخن فہمی میں ظہیر کے برابر کم ہی لوگ ہوتے ہیں ۔ حافظ پر ان کی کتاب اس بات کا ثبوت ہے !

بہت سے ترقی پسندوں میں میں نے ایک بات پائی ہے کہ وہ ہر ادبی تخلیق میں کوئی پیغام یا سیاسی تحریک ڈھونڈھتے ہیں ۔ ظہیر اس نظریے سے بہت بلند تھے اور اسی نے ان کو حافظ کا اتنا بڑا پرستار بنا دیا خود میری شاعری میں کہیں کہیں پیغام مزدور ہے اور مقصد بھی لیکن زیادہ تر خالص جمالیاتی ہے ۔ جہاں تک میرا ذہن کام کر رہا ہے میری نظم شام عیادت کا سب سے پہلا ریویو ظہیر نے اپنے اخبار میں میری شاعری کے بارے میں لکھا ۔ فراقؔ کے بعض اشعار نشتر ہوتے ہیں اور بعض وہ بلا وجہ استادی کے لیے کہتے ہیں " میں نے ان کا یہ جملہ جب پڑھا تو چالیس شعر کہہ کر کے بھیج دیئے اور لکھ دیا کہ جو چاہو کاٹ دو جو چاہو چھاپ دو انھوں نے پوری غزل چھاپ دی ایک شعر اس غزل کا یاد آ رہا ہے لکھو !

کسی نے نیم نگاہی سے مجھ کو دیکھا تھا
یہ زندگی ہے اسی زخم ناتمام کی یاد

اس کے علاوہ میری بعض دوسری غزلیں بھی بہت پسند کرتے تھے

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

اور یہ شعر ان کو بہت ہی پسند تھا

مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاہیاں تیری
مجھ سے حیات و موت بھی آنکھیں چرا کے رہ گئیں

فراقؔ صاحب خاموش ہو گئے ۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جب وہ اپنے گزرے ہوئے اور اپنے دور دوستوں کی بات کرتے ہیں تو فوراً وہ جذباتی ہو جاتے ہیں اور انھیں کسی خاص شئے کی ضرورت ہونے لگتی ہے ۔ میں نے دیکھا کہ جب بھی شعر و شاعری کی بات چلی وہ کسی چیز میں ڈوب کر اس موضوع پہ باتیں کرنا چاہتے ہیں تاکہ باتیں خوشگوار ہوں ماحول بھی دلچسپ رہے اور مزاجی کیفیت رنگا رنگ میں ڈوب جائے ۔ ایک خوش رنگ گلاس الا کے میز پر آ گیا، پنکھا تیزی سے اوپر چل رہا تھا ۔ اس سے قبل ان کی زبان میں لغزش آئے میں اپنی بات ختم کر دینا چاہتا تھا

میں آپ سے ترقی پسند تحریک کے بارے میں کچھ باتیں جاننا چاہتا ہوں کہ جاوید ظہیر آپ کے تئیں اس تحریک میں کس

اکس طرح کا رول ادا کیا ہے

وہ کچھ سوچنے لگے پھر اچانک بول پڑے

(ج) میں تو ادب کا تحریک سے رشتہ جوڑنے کے سخت خلاف ہوں۔ ادب کا تحریک سے کیا تعلق۔ ادب کیا کانگریس پارٹی ہے کہ جس کے آپ ممبر بن جائیں اور آئیں شامل ہو کر تحریک میں حصہ لیں — تمام دنیا کے لٹریچر دیکھ لو۔ تمام IMMORTAL. LITER. کا کیا کسی تحریک کے ذریعہ ہی لکھے گئے ہیں۔ سنسکرت میں تو کوئی تحریک وغیرہ نہیں ہوئی پھر بھی زبردست کتابیں لکھی گئیں گیتا وغیرہ کیا کسی تحریک ہی کی وجہ سے وجود میں آئی۔ عربی، فارسی کسی بھی زبان کو غور سے دیکھو کسی کا بھی تعلق تحریک سے نہیں رہا۔ میں ترقی پسند تحریک کو بھی پسند نہیں کرتا۔ ہاں مخالفت نہیں اور میں مخالفت کیوں کرنے لگا اور مخالفت نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے بانی سجاد ظہیر تھے میرے دوست حالانکہ میں ان کو ابتدا ہی سے کھاتا رہا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو ایک بار تو میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ۔۔ ظہیر تحریک وغیرہ میں وہی حصہ لیتا ہے۔ جو خود بڑا آدمی نہیں ہوتا۔ پھر اس تحریک سے اردو ادب کو بہت زیادہ فائدہ نہیں پہونچا — ایک بار سجاد ظہیر ترقی پسندوں کے ایک اجتماع میں الگ ورتھ کو لے گئے تو میں نے ظہیر سے یہاں تک کہہ دیا کہ تم مجھے ترقی پسندوں کے درمیان نہیں رنڈیوں کے محلے میں لے آئے ہو میں کچھ نہیں کہہ سکتا! میں ادب کو تحریک سے جوڑنے میں کنکر نکلنے والی بات تصور کرتا ہوں

میرے ذہن میں اچانک بہت سے سوال گونجنے لگے۔ لیکن میں نے مصلحتاً ضبط سے کام لیا اور صرف اسی اگلے سوال پر اکتفا کیا۔

س۔ آپ اگر ادب میں تحریک کے سلسلے میں اس قدر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو باقاعدہ اس تحریک سے الگ کیوں نہیں ہو گئے۔ آپ تو اس تحریک میں باقاعدہ ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور آپ نے خود بعض مقامات پر اس کو تسلیم کیا ہے

ج۔ بھئی سردار جعفری نے اپنی کتاب میں لکھ دیا اور ساتھ میں یہ بھی لکھ دیا کہ جب سے میں اس تحریک میں شامل ہوا تبھی سے میری شاعری میں دم خم آگیا حالانکہ میں اس میں قطعی شامل نہ تھا۔"

س۔ ایک سردار کیا۔ عزیز احمد، خلیل الرحمان اعظمی کی کتابوں میں اور خود سجاد ظہیر کی جانب سے اپنی کتاب روشنائی میں آپ کا تذکرہ کیا ہے کیا وہ غلط ہے؟

ج۔ بھئی سجاد ظہیر تو میرے دوست ہی تھے لیکن ان لوگوں نے کیوں کیا یہ تو وہی بات ہوئی کہ میں کچھ نہیں۔ اور میرے چچا منسٹر ہیں تو سب سے یہی کہتے پھر رہے ہیں کہ میں تو منسٹر کا بھتیجا ہوں تو اس سے عزت بڑھے۔ کوئی بھی بڑا آدمی بتا دیجئے جو اس تحریک میں شامل رہا ہو یا کسی کی سرپرستی بھی ہو!

س۔ کیوں اقبال، پریم چند، ٹیگور۔ جیسے زبردست ادیب و شاعر جن کی آپ خود تعریف کرتے ہیں اس تحریک کے ابتدائی جلسوں میں شریک تھے۔ انکی سرپرستی اس تحریک کو شامل نہیں تھی!

(ج) اقبال، پریم چند، ٹیگور۔ یہ سچ ہے کہ یہ سب اس تحریک میں شریک رہے اور انکی سرپرستی بھی شامل رہی لیکن مسکراتی ہوئی سرپرستی جیسے تم کسی وقت میرے پاس آؤ اور کہو کہ ایک جلسہ کر رہا ہوں آپکی نگرانی میں آپکی سرپرستی میں تو میں مسکرا کر تمہارا دل رکھنے کے لئے مان لوں گا اس طرح صرف سجاد ظہیر کا دل رکھنے کے لئے انھوں نے سرپرستی کی ورنہ یہ لوگ قطعی اس تحریک سے متاثر نہ تھے آپ بتلایئے کوئی حالی بنا ہے کوئی شبلی بنا ہے اس تحریک کے ذریعہ ہمارے یہاں! چوٹی کا پسینہ ایڑی تک آجاتا ہے حالی اور شبلی بننے کے لئے اتنا آسان نہیں یہ لوگ تو معمولی لوگ نہ تھے!

حضور! جن کو قیامت تک اپنا مقام نہ ملنے کا احساس ہو جاتا ہے وہ تحریک کا سہارا لیتے ہیں تحریک چلی ضرور چلی لیکن اگر سید سجاد ظہیر جیسا MOST POWERFUL ORGANISER اس کا بانی نہ ہوتا اور دکھی کا یہ دم توڑ چکی ہوتی

باتیں کچھ سنجیدہ ہو گئیں۔ فراق صاحب جذباتی ہو رہے تھے

س۔ تو آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو ادب میں اس تحریک کی قطعی ضرورت نہ تھی اور اس سے کوئی بھی فائدہ نہ ہوا

ج۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ادب میں اور ہندوستان میں اس تحریک کی ضرورت نہ تھی بعض فائدے بھی ہوئے ہیں اس تحریک سے جو مشاہیر ادب خاص طور پر پریم چند جواد بی طور پر مہارت حاصل کر چکے تھے لیکن سیاسی طور پر شعور گو ب نہ تھے ہندوستان تک ہی محدود تھے۔ انہاں ٹیگور پہلے ادیب ہیں جو پہلے دلتوں پر ہمارے سامنے آئے جن کو ہر طرح سے بنیادی معلومات تھی اور ان دونوں نے ان ساری چیزوں کو ادب بنایا حالانکہ یہ بہت بڑا کام ہے جو بعد میں اس تحریک کا کوئی ادیب نہ کر سکا۔ عباس، ساحر، جعفری، مجروح، کرشن چندر یہ سب اچھے ہیں لیکن کوئی بھی کھل کر مضبوطی کے ساتھ ٹیگور اور اقبال کی طرح سامنے نہیں ہوتا۔ یہ تھوڑا بہت فائدہ اس تحریک سے ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ سجاد ظہیر کا ہی دم تھا جو اس کا بنیاد پر ڈال گیا اور اس کے بعد اس کی جس جیسی شخصیت نہیں رہی چھوٹے موٹے لوگوں کے ہاتھوں میں یہ تحریک آ گئی جو اپنی سرپرستی جتلاتے رہتے ہیں اور پوری تحریک کو قابو میں کرنا چاہتے ہیں اس پر سرپرستی کرنا چاہتے ہیں تو یہ سرپرستی کم از کم میرے ساتھ نہیں چل سکتا

س۔ آپ کے خیال میں وہ لوگ کون ہیں جن کے ہاتھ میں اس تحریک کی سرپرستی ہے یا جن کی ذات سے اس تحریک کو نقصان پہنچا ہے

یہ سوال بڑا اہم اور نازک تھا میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ ہچکچا رہے ہیں ان کے لبوں پہ کچھ نام آ کے لوٹ رہے ہیں

ج۔ بھئی یہ سوال تو بڑا نازک ہے نام تو میں بہت گنوا سکتا ہوں لیکن بات بگڑ جائے گی لیکن دو آدمیوں کا نام لینے میں مجھے ذرا بھی تشویش نہیں اردو میں سردار جعفری اور ہندی میں رام بلاس شرما نے اس تحریک کو اپنی میراث سمجھ لی ہے۔ میں دونوں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں ان لوگوں نے چھوٹوں پر سرپرستی تو کی ہے بڑوں پر بھی سود باد سرپرستی

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے بات کچھ ختم ہوتی نظر آئی میں نے باتوں کا رخ موڑ دینا چاہا

س۔ سجاد ظہیر صاحب کے بارے میں کچھ اور بتائیے آپ تو ان کے بہت قریب رہے ہیں؟

ج۔ سجاد ظہیر میں کوئی چھوٹی بات نہ تھی وہ کسی معاملے میں بھی چھوٹے پن کے نہیں سوچتے تھے آج تک کوئی ایسی خورد بین نہیں ایجاد ہوئی جس میں ان کی شخصیت ان کے عمل اور ان کے نظریات میں چھوٹا پن نظر آ سکے بڑکپن، لیڈری اور دلفریبی کی مہر ان کی پیشانی پہ تھی۔ ذرا سی دیر میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جمع کر لینا ان کے لئے بہت آسان تھا لکھنؤ کی راتیں سجاد ظہیر کے سلسلے میں یادگار رہیں گی میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس سے اچھا آدمی میں نے اپنی زندگی میں دیکھا بھی ہے یا نہیں میرے اچھے دوستوں میں مجنوں اور جوش رہے لیکن اتنی کشش ان دونوں میں بھی نہ تھی یہاں تک کہ نہرو یا ان کے والد موتی لعل نہرو یا کسی بھی بڑے آدمی میں نہ تھی۔ ایسے ہر دلعزیز کا دشمن ہونا اس آدمی کیلئے بھی ممکن نہ ہوا جو اس کا دشمن ہو!

وہ کچھ تھکے تھکے سے نظر آنے لگے سرور ذہن پر قابض ہو چکا تھا

بس حضور ایک چھوٹا سا سوال عرض ہے

پوچھو بھئی ۔۔۔ انھوں نے اپنے مخمور انداز میں کہا

س۔ جس وقت سجاد ظہیر صاحب کے انتقال کی خبر آپ نے سنی تو فوری طور پر آپ کا کیا ردعمل رہا

ج۔ سجاد ظہیر کی جب میں نے موت کی خبر سنی تو میں بہت غمگین ہو گیا اور بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ ایک نہایت قابل قدر

نغمۂ جمہور!

یوم سجاد ظہیر کے موقع پر

۱۶ر نومبر ۷۵ء

—— : واصف عابدی سہارنپوری

قصرِ تہذیب کے معمار صحافی و ادیب　　روحِ محرابِ عمل، منبرِ دانش کے خطیب
مالکِ عرصۂ فکر، وارثِ معراجِ حیات　　معنئ لوح و قلم، حرفِ نگار کے نقیب
عزم بیمثل ترا، فکر تری لا محدود
کتنے خورشید تری راہ میں ہیں سربسجود

تجھکو فطرت کے اشارات کا محرم کہیے　　کبھی جذبات کا شعلہ، کبھی شبنم کہیے
ترے سینے میں دھڑکتا تھا اک انساں کا دل　　ایسا انسان جسے فاتحِ عالم کہیے
زندگی کیا ہے یہ احساس جگایا تونے
نئے انداز سے ذہنوں کو بنایا تونے

تیری تحریر کا شہکار "نقوشِ زنداں"　　"پگھلا نیلم" ہے ترے حسنِ تخیل کا نشاں
نثر کے روپ میں محفوظ ہیں "انگارے" بھی　　جن سے ہر رنگ میں باقی ہے ترا سوزِ نہاں
"روشنائی" سے دیا تونے ترقی کا پیام
رقص کرتا ہے ترا بادۂ نو جام بہ جام

تو حدیثِ رسن و دار تھا، سجاد ظہیر　　قلبِ مزدور کی للکار تھا، سجاد ظہیر
جرأتِ عشق سے دہرائی ہے تاریخِ وفا　　کتنا روشن ترا کردار تھا سجاد ظہیر
قید خانہ میں رہا جذبۂ بیدار کے ساتھ
نام ابھرا ترا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

آج فنکار تری یاد مناتے ہیں تمام　　پیش کرتے ہیں سبھی اہلِ نظر تجھکو سلام
ذکر تیرا ہے محبت کے شبستانوں میں　　نظم کی آڑ میں تجھ سے ہے یہ واصف کا کلام
عصرِ حاضر کا ترا انشا ہوا دستور کہیں
زیب دیتا ہے تجھے نغمۂ جمہور کہیں



حمل گرانا جائز ہے کن حالتوں میں؟

بعض اوقات حمل گرانا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔

جب حمل کا جاری رہنا عورت کی زندگی کے لئے خطرہ بن جائے یا اس سے اس کی جسمانی یا ذہنی صحت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو،

جب اس بات کا خطرہ ہو کہ پیدا ہونے والے بچے کی نشو ونما میں کوئی شدید جسمانی یا ذہنی نقص رہ جائیے گا

جب حمل عصمت دری کے نتیجے کے طور پر ہوا ہو،

جب معاشی وسماجی حالت دراصل ایسی ہو یا مستقبل قریب میں ایسی حالت پیدا ہونے کا امکان ہو، جس سے ماں کی صحت کو نقصان پہنچ سکتا ہو،

جب حمل روکنے کے کسی طریقے کے ناکامیاب ہو جانے سے حمل ٹھہر گیا ہو،

پہلے بارہ ہفتوں میں حمل آسانی سے گرایا جا سکتا ہے۔



مُفت مشورے کے لئے نزدیک ترین سرکاری ہسپتال میں جائیں۔

ظہیر ناشاد دھنگوی

سجاد ظہیر یادوں کے آئینے میں

ترقی پسند تحریک کے بانی اور رہنما، ہندوستان کی کمیونسٹ تحریک کے عظیم سپوت، قومی جنگ آزادی کے ایک بیدار مغز اور باشعور رہنما سید سجاد ظہیر مرحوم سے میری ملاقات ۱۹۶۱ء میں جشن صد سالہ ٹیگور کے موقع پر کلکتہ میں ہوئی۔ مرحوم جشن صد سالہ ٹیگور کا اہتمام و انتظام کرنے کی غرض سے دو تین دن قبل اپنی بیگم رضیہ سجاد ظہیر کے ساتھ کلکتہ تشریف لائے تھے اور پارک سرکس میں مسٹر پرکاش نیر کے مکان میں قیام پذیر تھے۔ شمس الزماں، اویس احمد دوراں اور میں ایک ساتھ ان سے ملنے گئے۔ جناب شمس الزماں نے ہم دونوں کا تعارف کرایا اور بنے بھائی ہم لوگوں سے گلے ملے۔ پھر گھنٹوں ان سے مختلف موضوعات پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ مرحوم نے اپنی بیگم رضیہ کو جو اس وقت دوسرے کمرہ میں چند نوجوان لڑکیوں کے ساتھ محو گفتگو تھیں) آواز دیتے ہوئے کہا۔ رضیہ ادھر آؤ تمہارے کچھ نوجوان دیور آئے ہوئے ہیں۔ ان سے بھی ملو اور ان لوگوں کے لئے چائے کا تو انتظام کرو۔ بیگم رضیہ سجاد ظہیر فوراً تشریف لائیں اور ہم لوگوں سے ملنے کے بعد دوسرے کمرہ میں جاکر اسٹوو پر چائے بنانے لگیں، تھوڑی ہی دیر میں چائے لیکر آگئیں اور ہم لوگوں نے ایک ساتھ چائے پی۔

جناب شمس الزماں نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔ ظہیر ناشاد صاحب ایک نوجوان شاعر و ادیب ہونے کے علاوہ کلکتہ ڈوک لیبر بورڈ کی ایک ٹریڈ یونین کے سکریٹری ہیں اس لئے سجاد ظہیر مرحوم دیر تک مجھ سے مزدوروں کے مسئلوں پر بڑی دلچسپی کے ساتھ گفتگو کرتے رہے اور بمبئی اور لندن کے جہازی مزدوروں کے بارے میں بہت سے واقعات بھی تفصیل سے سنائے۔ شمس الزماں نے دوران گفتگو مرحوم سے انکی مشہور تصانیف روشنائی اور لندن کی ایک رات، سے متعلق بعض سوالات کئے اور ادیب احمد دوراں نے ترقی پسند ادب کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کی گذارش کی اور میں نے یہ سوال کیا کہ ترقی پسندوں پر عام طور پر یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کو نہیں مانتے ہیں اور مذہب کو افیون کی گولی تصور کرتے ہیں لہٰذا اگر آپ اس موضوع پر روشنی ڈالکر میرے شک و شبہات کو دور کریں تو کرم ہوگا۔ بنے بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں آپ نوجوانوں کے سوالات سن کر بہت خوش ہوں کیونکہ آپ لوگوں کے اندر کچھ جاننے اور سیکھنے کی خواہش ہے یہ بڑی اچھی بات ہے۔ پھر اس کے بعد ہمارے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا ۱۹۳۵ء میں انگلستان میں ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی اور اس کے تشکیل کے سلسلہ میں ملک راج آنند جیسے باشعور اہل قلم نے نمایاں حصہ لیا اور جب اس انجمن کی بنیاد ہندوستان میں پڑی تو ملک کے اکثر و بیشتر روشن خیال فن کاروں نے شعوری طور پر ہمارا ساتھ دیا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ابتدا میں کچھ لوگ فیشن کے طور پر ہماری تحریک کے ساتھ ہو گئے جسکی وجہ سے ہماری تحریک کو کچھ نقصان بھی پہونچا مگر بقول شخصے فیشن کی فطرت یہ ہے کہ وہ بہت جلد پرانا ہو جاتا ہے چنانچہ اب ان فیشن پرستوں کا جادو ٹھنڈا ہو چکا ہے جن فیشن پرستوں نے ترقی پسند تحریک کا نام لیکر مذہب پر کیچڑ اچھالنے کی ناپاک کوشش کی ہے ان سے تحریک کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا ہے

اور نہ اب ہے

ترقی پسندوں کی وکالت کرتے ہوئے مرحوم نے کہا۔ ترقی پسندوں پر خدا کے منکر ہونے کا الزام سراسر لغو اور جہل ہے۔ یہ الزام تو صرف مذہب کے ٹھیکیداروں نے اپنی دکانوں کو چلائے رکھنے کی غرض سے عاید کیا ہے جن کے بارے میں احسان دانش نے کہا ہے

خانقاہوں میں دلوں کا مدعا بکتا رہا
مدتوں سے ان کی دوکانوں میں خدا بکتا رہا

دنیا کے تمام بڑے مذہبوں اور بڑے فلسفوں کی طرح ہم ترقی پسندوں کے اخلاق کا اساس بھی ان تمام اچھائیوں پر ہے جن میں انسان کی اجتماعی بھلائی ہے اور ان تمام برائیوں کی مخالفت پر ہے جس سے انسانوں میں دشمنی، عداوت، انتشار، تفرقہ، بغض یا تنازعہ پیدا ہونے کا خوف ہے۔ ترقی پسندوں نے ہمیشہ سیٹھ ملاّ کی خودساختہ روایتوں پر حملہ کیا ہے اور یہ کوئی خراب بات نہیں ہے ———— خود اقبال نے بھی اس قسم کے حملے کئے ہیں۔ ہمیں مذہب سے نہیں بلکہ مذہب کے اندر داخل کی ہوئی برائیوں سے نفرت ہے اور اسی قسم کا خیال مہاتما گاندھی کا بھی تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ——— Hate the sin not the sinner:

اس مقام پر بندہ نے ایک اور سوال کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادھر کچھ دنوں سے آپ نے لکھنا تقریباً بند کر دیا ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ موصوف نے میرے اس سوال کا جواب دینے سے قبل فیض کی نظم سفرنامہ کا یہ شعر پڑھ کر سنایا۔

یوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں کروڑوں میرے
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن، دشت و چمن کی حد ہے!

پھر اسکی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں پہلے تنہا لکھا کرتا تھا لیکن اب کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ کروڑوں ہاتھوں سے لکھ رہا ہوں۔ میں نے ترقی پسند انجمن کے پلیٹ فارم پر ملک کے بہت سے فن کاروں کو متحد دیکھا کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت سے فن کاروں کو عالمی مسائل پر لکھنے کے لئے آمادہ کیا ہے۔ بہت سے ترقی پسندوں نے میرے کہنے پر لازوال تخلیقات پیش کی ہیں۔ جن کے متعلق میں نہایت ایمانداری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں خود ان موضوعات پر قلم اٹھاتا تو شاید میں ان سے بہتر طور پر اظہار خیال نہ کر سکتا تھا اور میں اپنے سوال کا اتنا اچھا جواب سنکر مطمئن ہو گیا

اس میں شک نہیں کہ سجاد ظہیر مرحوم کی عہد ساز شخصیت کے فیض تربیت سے بہت سے نئے ادیبوں نے اکتساب فن کیا اور بہت سے شاہیر فن کاروں کو انکی قیادت پر فخر و ناز تھا۔ مرحوم نے زندگی بھر ذہین و ہونہار فن کاروں کی پر خلوص حمایت کی اور انکی ذہنی تربیت سے ماہتاب و آفتاب بن کر چمکنے کا موقع دیا!

سجاد ظہیر نے اپنے خون جگر سے ان گنت مشاہیر ادبی شخصیتوں کی تزئین و آرائش کی ہے

جسکی مثال کم از کم بیسویں صدی میں کم ہی ملتی ہے

ادیب احمد دوراں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بنے بھائی نے کہا کہ ادب برائے ادب کی بحث بہت پرانی ہے سب سے پہلے یہ تحریک فرانس میں شروع ہوئی اور وسلر (WHISTLER) نے انگریزی ادب کو اس سے روشناس کرایا اور آسکر وائلڈ نے اسکی سرپرستی کی۔ اسی زمانے میں ایک ادبی رسالہ YELLOW BOOK بھی شائع ہوا تھا جس میں اس تحریک کو خوب خوب اچھالا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ترقی پسند ادب نے اسکی مقبولیت کو کم کرنا شروع کیا اور اب صورت حال ہم سب لوگوں کے سامنے ہے!

ادب برائے زندگی :۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے قدیم ادبی شہ پاروں میں عام حقیقتوں کا بیان ملتا ہے لیکن کسی خاص حقیقتوں کی طرف توجہ نہیں ملتی۔ وہ مجموعی طور پر روایات ہی کے پابند ہیں لیکن حال اور مستقبل جو زندگی کے اہم حقائق ہیں ان پر توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اسلئے ہمارے قدیم ادب میں مجموعی طور پر جمود چھایا ہوا ہے اور ان میں جوش یا حرکت حیات کم ہے۔ اور وہ روحانی زندگی سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ اسلئے ہمارا ترقی پسند ادب، قدیم ادب اور شاعری کے غیر متحرک رجحانات کو الٹ دینا چاہتا ہے اور انہی کی کمی کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ ترقی پسند تحریک قدیم ادب کی یکسر مخالف نہیں ہے۔ اگرچہ ظاہر میں مخالفت معلوم ہوتی ہے ترقی پسند تحریک زندگی کے تمام پہلوؤں کو زیادہ تفصیل سے پیش کرنا چاہتی ہے۔

فنکار کا فرض اول یہ ہونا چاہیئے کہ وہ زندگی کی بھرپور نقاشی کرے۔ اور جو فنکار زندگی سے جتنا ہی قریب ہوگا وہ اتنا ہی بڑا حقیقت نگار بھی ہو سکے گا چونکہ ادب کے موضوع کی کوئی تخصیص نہیں ہے اس لئے دنیا کا غلیظ سے غلیظ تر موضوع یا مضمون آرٹ کے لئے جائز ہے جسکی مثال ہمیں نظیر اکبرآبادی کے یہاں ملتی ہے۔ نظیر کا سب سے بڑا کارنامہ ایک ٹھوس زندگی کی طرف توجہ تھی۔ اقبال کے یہاں زندگی کو فعال اور متحرک بنانے کا پیغام ملتا ہے اور غالب کے کلام میں رجائیت کے عناصر ملتے ہیں اسلئے ہم ان کو ترقی پسند شعراء کی صف میں شمار کرتے ہیں۔ نثر کی دنیا میں میرامن، سرسید احمد خاں، حالی، آزاد، شبلی، نذیر احمد، منشی پریم چند وغیرہ نے انقلاب پیدا کیا اسلئے ہم ترقی پسند انکی عظمت کا خاص طور پر احترام کرتے ہیں

بنے بھائی نے "انگارے" کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کی اشاعت کا خاص مقصد پرانے اور دقیانوسی سماج پر حملہ کرنا تھا جو بہرحال انجام پا سکا کیونکہ انگارے کے توسط سے احمد علی، رشید جہاں اور میں نے خصوصیت کے ساتھ غلط رسم و رواج کے خلاف شدید حملے کئے۔ حمایت بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اور پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی کی تھی سب سے آخر میں حشر الزماں صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے موصوف نے کہا کہ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی زمانے میں میں نے "لندن کی ایک رات" لکھی تھی جس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ - اردو ایک بگڑتے ہوئے تمدن کے بستر مرگ پر پیدا ہوئی۔ مگر اب مختلف تمدنوں کی آماجگاہ بن چکی ہے جس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ہمارے سوالوں کا جواب دینے کے بعد سجاد ظہیر مرحوم ہم لوگوں کے ساتھ حضرت پرویز شاہدی سے ملنے گئے وہاں پرویز صاحب اور بنے بھائی کے درمیان ہونے والی علمی و ادبی گفتگو کا سلسلہ تقریباً ایک بجے دن تک جاری رہا اور ہم لوگ ان بزرگوں کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے رہے پھر اس کے بعد پارک سرکس میدان میں بنے بھائی کی عالمانہ تقریر سننے کا موقع ملا اور دوسرے دن جناب سالک لکھنوی کی رہائش گاہ پر ترقی پسند مصنفین کا جلسہ منعقد کیا گیا جس میں بنے بھائی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی غرض و غایت کے موضوع پر ایک مدلل اور بصیرت افروز تقریر کی اور بیگم رضیہ سجاد نے اپنا افسانہ سنایا

اس کے بعد ایک بار اور بھی مرحوم سے کلکتہ میں اچھی ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھ سے ہفتہ وار عوامی دور ...

دہلی میں اپنا کلام بھیجتے رہنے کیلئے لکھا اور میں نے جب بھی اپنا کلام ان کے پاس بھیجا تو وہ نہایت محبت کے ساتھ اسے ہمارے دونوں میں چھاپتے رہے

سجاد ظہیر ایک بڑے دانشور، ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے زندگی بھر ہمارے معاشرے ہماری زندگی اور ہمارے ادب کی صحت مند قدروں کی ترجمانی کی اور انتہائی صبر آزما حالات میں بھی جمہوریت پسندی، انسان دوستی، سوشلزم اور سیکولرازم کا پرچم سربلند رکھا سجاد ظہیر مرحوم ایک باشعور اہل قلم، بیباک مقرر، نڈر صحافی اور ایک عظیم انسان دوست تھے وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک رجعت پرست قوتوں، سامراجی طاقتوں، مفاد پرستوں اور جمہوریت کے دشمنوں کے خلاف پورے استحکام کے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ مرحوم نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ جو ہماری ادبی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں اس گھر ا ہے ہم اس کی لذت بہت دنوں تک محسوس کرتے رہینگے۔

سجاد ظہیر مرحوم کو سرمایہ دارانہ نظام کی لعنتوں، لسانی تعصب، نسلی امتیاز، علاقائی تنگ نظری مذہبی عصبیت اور سماج دشمن خیالات سے سخت دلی نفرت تھی جس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے رفقائے کار کو بھی انسان دشمن فلسفہ کو پروان چڑھانے والی تحریکوں کے خلاف پوری شدومد کے ساتھ لکھتے رہنے کے لئے جوش دلاتے رہے۔ وہ اس خیال کے کٹر حامی تھے کہ ادب کے کام پر اہل تحریروں کے ذریعہ عوام کے ذہنوں کا استعمال کیا جائے اور قلم کی بے پناہ طاقت کو رجعت پسند دلال اور سامراجی قوتوں کی سازشوں کا آلہ کار بننے دیا جائے۔ مرحوم کو ملک کے سیکولر اور جمہوری ڈھانچے سے بیحد محبت تھی اور بائیں بازو کی رجعت پرستی اور فاشزم کے خلاف تادم مرگ اپنی نوک قلم سے تیز تلوار کا کام لیتے رہے

ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر دراصل ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں سجاد ظہیر ترقی پسند عہد کے ادبی سرتاج تھے۔ بانی ترقی پسند ادب کی حیثیت سے ان کا نام رہتی دنیا تک زندہ و پائندہ رہے گا نیز یہ کہ دنیا کے مختلف زبانوں کے فن کاروں کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کے سلسلہ میں ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جا سکے گا اور ایک خاص بات جو ان کو حیات جاوداں بخش سکے گی وہ بقول شاعر یہ ہے کہ ؎

ع سرمایہ دار فن تھا مگر خاکسار تھا۔

ڈاکٹر قمر رئیس

دہلی میں ترقی پسند ادیبوں کا یادگار اجتماع

ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور تنظیم کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر ۱۷ اور ۱۸ اپریل ۱۹۷۶ء کو دہلی میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس اور مذاکرہ ہوا۔ جس میں ممتاز مشاہیر عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، آنند نرائن ملا، قرۃ العین حیدر، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، علی سردار جعفری، ڈاکٹر محمد حسن، غلام ربانی تاباں، کوثر چاند پوری، کشمیری لال ذاکر کے علاوہ نئی پود کے ادیبوں نے بھی جوش و خروش سے شرکت کی۔ اس اجتماع میں ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم نو کے مسائل اور ترقی پسند تحریک اور ادب کے بعض پہلوؤں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اور اندیشہ ظاہر کیا کہ اس تحریک کے نئے سفر میں بھی اگر پرانی کمزوریاں ساتھ رہیں تو یہ کامیاب نہ ہو سکے گی۔ لیکن بیشتر ادیبوں نے گزشتہ چالیس سال میں اس تحریک کی بے مثل خدمات کو سراہا اور کہا کہ اس مدت میں جو بہترین ادب پیدا ہوا ہے وہ براہ راست یا بالواسطہ اسی ہمہ گیر تحریک کی دین ہے۔ پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں کہا تھا

ہماری کسوٹی پر اب وہ کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں"

کانفرنس کے مندوبین کا پہلا اجلاس ۱۷ اپریل کو صبح کو ساڑھے دس بجے غالب اکیڈمی میں شروع ہوا۔ ڈائس پر مجلس صدارت میں عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، قرۃ العین حیدر، علی سردار جعفری، ڈاکٹر سید محمد عقیل کے علاوہ مجلس استقبالیہ کے صدر آنند نرائن ملا اور جنرل سکریٹری غلام ربانی تاباں تشریف رکھتے تھے۔ جنرل سکریٹری کی رپورٹ ڈاکٹر اجمل اجملی نے پڑھی

رپورٹ میں گزشتہ چالیس سال میں تحریک اور تنظیم کے نشیب و فراز کا جائزہ لیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ترقی پسند ادیب اپنے محنت کش عوام اور بنی نوع انسان کی آرزوؤں اور امنگوں کے ہمنوا رہے ہیں۔ ایک بہتر سماج، ایک بہتر زندگی کے لئے رجحان کی جانبازانہ جدوجہد کی حمایت اور اس جدوجہد کے خلاف ہر طرح کے جبر و تشدد کی مذمت کرتے آئے ہیں۔ آج بھی ہم

نصب العین ہمارے سامنے ہے ! ادیب اپنے عہد کی آواز اور اپنے عوام کا ضمیر ہوتا ہے ۔ وہ مایوسی، بے بسی اور انتشار کی طاقتوں کے مقابلہ میں پرعزم حوصلہ خیز اور انقلاب آفریں عوامی قوتوں سے وابستہ ہو کر ہی اعلیٰ ادب کی تخلیق کر سکتا ہے

اس تفصیلی رپورٹ کے بعد علی سردار جعفری نے ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم کے مسائل پر اظہار خیال کیا انھوں نے کہا کہ ابتدا ہی سے اس تحریک اور تنظیم میں مختلف سماجی اور سیاسی نظریات رکھنے والے ادیب شامل رہے ہیں اس کے اولین معماروں میں اگر ایک طرف پریم چند تھے تو دوسری طرف سید سجاد ظہیر تھے جو کھلے ہوئے اشتراکی تھے تنظیم میں شامل ہونے والے ادیب وہ تھے جو اس کے مینی فیسٹو سے اتفاق رکھتے تھے ۔ لیکن تنظیم کے باہر بھی بہت سے ادیب اپنی تخلیقات میں ترقی پسند اقدار پر زور دے رہے تھے انھوں نے تحریک کے ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے قبل ہمارے سامنے کچھ واضح اور فوری مقاصد تھے جن کی وجہ سے ادیبوں کے اتحاد و تنظیم میں آسانی آئی

انھوں نے آج کے حالات میں تنظیم کی ضرورت اور اس کے نام کے بارے میں اظہار خیال کی دعوت دی سردار جعفری نے کہا کہ اگر کل ہند تنظیم اسی نام سے بنائی جائے تو ایسی دوسری انجمنوں کو اس سے الحاق کی اجازت دی جاسکتی ہے جو کسی دوسرے نام سے لیکن ان ہی مقاصد کو سامنے رکھ کر کام کر رہی ہوں ، ڈاکٹر قاضی عبدالستار نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن گذشتہ بیس سال سے سرگرمی سے کام کر رہی ہے لیکن رپورٹ میں اس کا ذکر نہیں آیا اور نہ ہی اس کے بعض اراکین کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی ، قمیصر شمیم، اظہار اثر، سرفراز عثمانی اور دوسرے نوجوان شرکا نے ترقی پسند مصنفین کے نام سے ہی تنظیم کی ضرورت پر زور دیا

آنند نرائن ملا صاحب نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ میرے نزدیک اپنے عہد کی قدروں کی ترجمانی کرنے والے ارتقا یافتہ ادب کا نام ترقی پسند ادب ہے اسے بے شک ایک منظم لیکن وسیع تحریک کی صورت دی جائے البتہ جو آپ کے خلاف ہیں ۔ آپ پر طنز کرتے ہیں انکو (اس میں) کوئی جگہ نہ دیجئے "، ملا صاحب نے زور دیکر کہا ادب میں سیاسی قدروں کے مقابلہ میں انسانی قدروں کی اہمیت زیادہ ہے

کیشری لال ذاکر نے کہا کہ ترقی پسند ادب کے ساتھ اردو زبان کی زندگی کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے اردو کی تعلیم کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے ، ہمیں اردو زبان کی بقا کے لئے بھی کچھ سوچنا اور کرنا ہے قرۃ العین حیدر نے اس پہ اظہار مسرت کیا کہ ترقی پسند ادیبوں کی انجمن نئے سرے سے منظم ہو رہی ہے لیکن انھوں نے انتباہ کے انداز میں کہا کہ تنگ نظری اور SECTARIAN رویہ کی طرف واپسی مناسب نہیں ۔ انھوں نے زور دیکر کہا کہ آج واضح طور پر اردو ادب میں دو دھارے ہیں ایک ترقی پسند طرز فکر کا دھارا ہے اور دوسرا بیمار ذہنیت کا دھارا ۔ کوثر چاندپوری نے کہا کہ ترقی پسند تحریک ایک ایسا زبردست طوفان تھا جس نے ساری دنیا کے ادب کو متاثر کیا اور آج بھی اسکی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

ڈاکٹر ظ انصاری نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ آج ترقی پسندوں کے سامنے سوال یہ ہے کہ ان کا نیا مینی فیسٹو کیا ہو ؟ رپورٹ میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ لفظ بہ لفظ وہی ہیں جو کانگریس بھی کہتی ہے ۔ ڈاکٹر انجم نے ملا صاحب کے خیالات کی حمایت کی ۔ ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی نے یہ سوال اٹھایا کہ ترقی پسند ادیبوں کی انجمن میں شامل ہونے والے ادیبوں کا معیار کیا ہو

انھوں نے کہا کہ اگر کوئی ادیب اشتراکی نقطۂ نگاہ کو مانتا ہے تو خواہ وہ انجمن میں شامل ادیبوں کی اکثریت کے نقطۂ نگاہ سے اختلاف رکھتا ہو اسکی گنجائش ہونی چاہیے

اسلم پرویز۔ لیکن اس کا ادیب ہونا شرط ہے! انیس جلالی نے کہا کہ ملّا صاحب نے انسانی قدروں پر زور دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ انسانی قدریں کیا ہیں؟ کیا وہ تغیر پذیر سماجی نظام اور اسکی آویزش سے الگ اپنا کوئی وجود رکھتی ہیں انھوں نے ترقی پسند ادیبوں پر تنگ نظری کے الزام کی تردید کی اور کہا کہ بات اس کے برعکس ہے

ڈاکٹر سید محمد عقیل نے کہا کہ آج کے ادبی اور اجتماعی حالات تیس چالیس سال قبل کے حالات سے بہت مختلف ہیں۔ نئی پود کے ادیب دوسرے ڈھنگ سے سوچ رہے ہیں۔ آج ہمارا ذہنی منبع ہماری زندگی ہے ترقی پسندی یہی ہے کہ ہم زندگی کو آگے بڑھانے والی قوتوں کا ساتھ دیں۔ انھوں نے شکایت کی کہ اس اجتماع میں نوجوان ادیبوں کی تعداد کم ہے

اقبال مسعود، غلام جیلانی، علی احمد فاطمی اور دوسرے نوعمر ادیبوں نے بھی اس اجتماع میں نوجوان ادیبوں نہ بلانے کا شکوہ کیا۔ آخر میں ہمایاں صاحب نے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ تمام مقررین نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے قیام کی حمایت کی ہے انھوں نے بتایا کل صبح کے اجلاس میں اس کا باضابطہ قیام عمل میں آئے گا

۷ اپریل کی شام کو پانچ بجے سمینار کے پہلے اجلاس کا آغاز ہوا۔ استقبالیہ میں مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے پنڈت آنند نرائن ملا نے حاضرین کو خطاب کیا۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے "ہم لوگ جو منتشر ہوگئے تھے اب وقت آگیا ہے کہ پھر ایک کارواں کے ساتھ آگے قدم بڑھا رہے ہیں" اب لگتا ہے کہ ان چند برسوں کی خاموشی سے ہماری تحریک کو اتنا نقصان نہیں ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ انھوں نے اپنے طور ترقی پسند تحریک کے عارضی تعطل کے اسباب کا تجزیہ کیا اور کہا کہ ایک زمانے میں ایک سیاسی تحریک کا ادبی محاذ بنانے کی کوشش بھی کی گئی جس کے نتیجہ میں سیاسی نعروں کو اہمیت دی جانے لگی انھوں نے کہا اصل میں ترقی پسند فکر کی ترقی سے عبارت ہے آج اردو میں ایک نیا ادبی گروہ سامنے آرہا ہے جس کو میں گمراہ کہوں گا۔ جو فکر و شعور کا ابلاغ تو بڑی بات بچوں کی طرح غوں غاں بھی نہیں کر پاتے۔ جسے زبان و بیان پر قابو نہیں۔ جو الجھی ہوئی موہوم اور مبہم باتیں کرتا ہے۔ ترقی پسندوں کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہا انھوں نے اجتماعی درد کو انفرادی درد پر ترجیح دی۔ آگے چل کر ملّا صاحب نے کہا کہ ایک فلاحی ریاست اور سوشلسٹ ریاست میں جو فرق ہے وہ تشدد کا فرق ہے میں تشدد کا روادار نہیں ہوں

ملّا صاحب کے بعد ہندی کے ممتاز ادیب اور ترقی پسند ادیبوں کی نیشنل فیڈریشن کے جنرل سکریٹری بھیشم ساہنی نے حاضرین کو خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند ادیبوں کی نیشنل منچ پر برابری کے ساتھ بیٹھ کر اپنے مسائل پر سوچ وچار کرتے آئے ہیں یہ تحریک دراصل ادیبوں کو زندگی سے جوڑنے کی تحریک ہے

سمینار کے اس اجلاس کا موضوع تھا، ترقی پسند تنقید کے چالیس سال۔ اس میں پروفیسر محمد حسن ڈاکٹر قاضی عبدالستار اور ڈاکٹر شارب ردولوی نے مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر شارب نے اپنے مقالہ میں نظریاتی اور عملی میدان میں ترقی پسند نقادوں بالخصوص اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، سید احتشام حسین، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن اور دوسرے نقادوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان نقادوں نے پہلی بار کچھ اصولوں کی بنیاد پر ادب کے معروضی اور سائنسی مطالعہ کی روایت کو پروان چڑھایا

قاضی عبدالستار نے تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا انھوں نے کہا کہ سماجی حقیقت نگاری کے اصول و ضوابط مرتب نہیں کیے گئے فنکار نقاد کی گردن پر سوار ہو گیا۔ ہندوستان کی روح کسان ہے۔ گاؤں ہے۔ جب کہ ہماری تنقید مزدور کے محور پر گھومتی رہی ہے۔ اس لئے وہ بے معنی ہو گئی اس نے سب سے بڑی سماجی حقیقت کسان کو نظر انداز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند نقادوں کو سماجی حالات کی روشنی میں آئین بندی کرنا پڑےگی۔

پروفیسر محمد حسن نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے پریم چند کے خطبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ آج بھی ادیبوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک بہت سے نشیب و فراز سے گذری ہے۔ لیکن یہ اسی تحریک کا فیضان ہے کہ ادب دانشِ حاضر کا ایک حصہ بنا عالمی ادب اور عالمی شعور سے اسے نہیں الگ رکھنے کا موقع ملا اس میں تاریخی قوتوں اور معاشی عناصر کی کارفرمائی ہوئی۔ اور اس کے سہارے ادبی تنقید میں بھی معروضیت کے انداز پیدا ہوئے۔ لیکن ترقی پسند تنقید حسن کے نئے معیار کی تلاش میں نکلی تھی اسمیں آگے کا میابانہ ہو سکی۔ سوچنا یہ ہے کہ ترقی پسند تنقید پر گروہ بندی اور سطحی پروپگنڈے کے الزامات کیوں عائد ہوئے؟ ادب کے طبقاتی مطالعہ کی اہمیت ہے جس کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی۔ لفظیاتی گہرائی اور وضاحت کے فقدان نے تنقید کو سیاست سے وابستہ کر دیا دیکھنا یہ ہوگا کہ کسی ادیب کی تحریر یہ کس طبقہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ سماجی تبدیلی کی خواہش کس رخ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ترقی پسند تنقید نے مزدوروں اور کسانوں کا نام تو لیا لیکن ان کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ نہ سکی۔ اس میں امریکا کی سطحیت پیدا ہو گئی۔ آج صورتحال کی ضرورت نے یہ ثابت کر دیا کہ سماجی انقلاب کے لئے ذہنی انقلاب لازم ہے۔ محنت کشوں کی تہذیبی رہبری کو قبول کرنا ضروری ہے۔ محنت کش طبقوں سے مکمل ہم آہنگی کے بغیر ادب اور تنقید آگے نہیں بڑھتے

بحث میں حصہ لیتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے کہا کہ ہم سیناروں میں بہت اونچی اونچی فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں۔ مزدوروں اور کسانوں کا ذکر بھی ہوتا آیا ہے لیکن سماج کا بڑا طبقہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ نظریات اور ادب عوام تک کس طرح پہونچے

عتیق حنفی نے ڈاکٹر محمد حسن کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ سماجیاتی تنقید کو مارکسی اصولوں اور جمالیات پر کاربند ہونا چاہیئے سماجیاتی تنقید کا موضوع عالمی سطح پر افسانوی ادب رہا ہے شاعری نہیں اس لئے کہ افسانوی ادب میں سماجی تصورات کا اظہار واضح شکل میں ہوتا ہے جو شاعری میں ممکن نہیں۔

انھوں نے اردو تعلیم کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک ایسی زبان میں جو مرر ہی ہو ادب کا سماجی رول کیا ہوگا؟ اس پر بھی سوچنا ہے !

حسن نعیم نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں نقاد کو بھی اپنے مطالعہ کیلئے ایک خاص صنف یا ایک خاص میدان کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ترقی پسند نقادوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہر صنف ادب پر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔

رفعت سروش نے کہا کہ ترقی پسند نقاد فنکاروں کا استحصال کرتے آئے ہیں۔ سردار جعفری نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ آج اگر عوام کو ادب تک لے جانا ہے تو اس کی سطح دوسری ہوگی۔ اس میں رمزی اور علامتی اظہار کا رنگ گہرا نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسندوں نے ایسی شاعری کی کامیاب تجربے کئے ہیں۔ انقلابی شاعروں، پبلو نرودا، مایاکوفسکی اور نذرالاسلام کی شاعری بھی بڑی حد تک راست اظہار کی شاعری ہے جسے عوام سمجھتے آئے ہیں

ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ عوام کی زبان میں ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ ہر تخلیقی تجربہ اپنی زبان آپ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ادیب کا کام یہ ہے کہ عوامی زندگی کے مسائل کو اپنی تخلیقات میں برتے اور پیش کرتے۔ قمر رئیس نے کہا کہ ترقی پسند نظریہ حیات اور ادب کو محنت کش عوام تک لے جانے کی بحث دلچسپ ہے۔ اسکی اپنی حیثیت ہے۔ لیکن شاید ڈاکٹر محمد حسن کا مدعا یہ نہیں تھا۔ قرۃ العین حیدر اور بعض دوسرے حضرات نے جو اس پر زور دیا ہے کہ ہم نے اپنے ادب میں جو کچھ کہا ہے محنت کش عوام تک نہیں پہنچایا ہے تو اس کے پیچھے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے متوسط طبقہ کی ذہنیت اور رعونت کارفرما ہے ہم کہتے ہیں کہ ہمارے تجربات اور اتنے دقیق ہیں کہ انھیں عوام تک پہنچنا چاہیئے۔ حالانکہ محمد حسن کا مدعا اس کے برعکس ہے۔ محنت کش عوام کے پاس بھی ہمیں دینے کے لئے بہت کچھ ہے آخر میں ڈاکٹر محمد حسن نے کہا کہ یہ سوچنا کہ عوام صرف راست شاعری ہی سمجھ سکتے ہیں رمزیہ علامتی شاعری نہیں۔ غلط ہے ان کی شاعری ان کا ادب علامتوں اور اساطیر سے بھرا پڑا ہے

۱۸ اپریل کو صبح کو دس بجے مندوبین کا اجلاس شروع ہوا جس میں تجاویز پیش کی گئیں۔ پہلی تجویز میں سامراجی طاقتوں کے ظلم و تشدد کے خلاف فلسطینی مجاہدین، چلی کے عوام اور روڈیشیا اور جنوبی افریقہ کے عوام کی جدوجہد اور اس جدوجہد میں وہاں کے ادیبوں کی حمایت اور احساس یگانگت کا اعلان کیا گیا اس تجویز کی حمایت کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے کہا کہ ملا صاحب نے سوشلسٹ اسٹیٹ کے قیام کے سلسلہ میں تشدد کی مذمت کی تھی۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ تشدد کا استعمال کب اور کن حالات میں ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں روس کی انقلابی پارٹی جو انقلاب لائی تو ایک امریکی صحافی کے قول کے مطابق وہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا۔ لیکن مغرب کی چودہ سامراجی طاقتوں نے سات سال تک اس انقلابی حکومت کو ختم کرنے کے لئے جنگ کی جس کا مقابلہ روسیوں نے طاقت کے ہتھیار اٹھا کر کیا۔ ویت نامیوں نے امریکی ظلم کا مقابلہ کرنے کے لئے جو جنگ کی اسکی حمایت پنڈت نہرو، اندرا گاندھی اور خود ملا صاحب نے بھی کی ہے ایک دوسری تجویز میں نئی دہلی پر اردو پروگرام شروع کرنے اور ابتدائیوں کا وقت بڑھانے کی حکومت سے اپیل کی گئی ایک تجویز میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ جن ریاستوں میں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد ہے وہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے کر وہ تمام سہولتیں فراہم کی جائیں جو آئینی طور پر اسے ملنی چاہیئے اس کے قبل یہ تجویز متفقہ طور پر منظور ہو چکی تھی کہ ترقی پسند تحریک کا ترجمان ایک ماہنامہ دہلی سے جاری کیا جائے ایک قرارداد کے ذریعہ اردو کے ممتاز ترقی پسند ادیبوں کی رحلت پر اظہار تعزیت کیا گیا اسی اجلاس میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کے عہدیداروں کا انتخاب بھی عمل میں آیا اور ایک سکریٹری کے نام کے علاوہ سارے نام اتفاق رائے سے منظور ہوئے! عہدیدار حسب ذیل ہیں

صدر : علی سردار جعفری

مجلس صدارت :- عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، کرشن چندر، غلام ربانی تاباں، ڈاکٹر محمد حسن، سہیل عظیم آبادی، رضیہ سجاد ظہیر!

جنرل سکریٹری ڈاکٹر قمر رئیس

سکریٹری ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، اختر سعید، راشد آذر، ڈاکٹر اجمل اجملی ڈاکٹر ادیب ظفر

غازی : ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کے علاوہ اکتیس افراد پر مشتمل ایک مجلس عاملہ کا انتخاب بھی عمل آیا جس میں نوجوان ادیبوں کی اکثریت ہے

سیمینار کے دوسرے اجلاس کا موضوع - ترقی پسند شاعری کا چالیس سال تھا اس میں ڈاکٹر وحید اختر کو بھی مقالہ پڑھنا تھا انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ لیکن اپنی علالت کی بنا پر وہ نہیں آ سکے۔ عمیق حنفی نے نظم پر اور ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی نے غزل پر مقالے پڑھے۔ عمیق حنفی نے کہا کہ بیانیہ شاعری بھی بڑی شاعری ہو سکتی ہے۔ بیانیہ نظم میں فکری شاعری کا نقطۂ کمال اقبال کی شاعری ہے۔ ترقی پسندوں کے یہاں نظم کی فکری سطح اور تعمیری شعور اقبال کے مقابلہ میں پست رہا۔ جوش کی شاعری لفاظی اور دریدہ دہنی کے سوا کچھ نہیں۔ علی سردار جعفری کی بعض نظموں میں خطابت کے باوجود فکری صلابت کا احساس ملتا ہے

انھوں نے کہا۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ سردار جعفری نے جوش کے بجائے اقبال سے زیادہ فیض اٹھایا ہے جن شاعروں نے نظم کو نئی جہتوں اور نئے معیاروں سے آشنا کیا ہے ان میں ن۔م۔ راشد، اختر الایمان اور فیض کی نمایاں حیثیت ہے عمیق حنفی نے اپنے مقالہ میں ترقی پسند شاعری کی کمزوریوں کے اسباب کی طرف بھی اشارہ کیا۔ صدیق الرحمان قدوائی نے ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں غزل کو نظرانداز کرنے کے اسباب کا تجزیہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ غزل مزاجاً ریزہ خیالی اور رمزیہ اظہار کا فن ہے۔ سماجی فکر کے واضح اظہار کیلئے غزل کے مقابلہ میں نظم کو زیادہ موزوں سمجھا گیا۔ بعض میں فیض اور مخدوم، مجاز، تاباں نے غزل کے امکان کو دریافت کرنے کی کوشش کی ترقی پسند شعرا جب ۱۹۵۰ کے بعد غزل کی طرف واپس آئے تو ایک نیا لہجہ لے کر آئے۔ جس میں احساس یاسیت کے ساتھ ایک گہرے طنز کی پھیل جانے والی کیفیت ملتی! اس میں شعلہ اور شہرادہ بہت تھا۔ نئی غزل نے اس باغیانہ کردار کو جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ ابھرا تھا زیادہ فروغ دیا

یہ غزل ایک اضطرابی کیفیت لے کر زبان اور علامتوں کے نئے تجربات کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ آج کی غزل میں سوچنے احساس ہونے اور تڑپنے کے لئے عشق کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ اور حال ہی میں جاں نثار اختر نے اسے کامیابی سے ذریعہ اظہار بنایا۔ مجموعی طور پر اس تحریک کے زیر اثر غزل کو پنپنے کا موقع نہ مل سکا

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو شعرا کی اکثریت کا تعلق متوسط طبقہ سے رہا ہے اس کی شاعری کا موضوع اور موضوعات بھی متوسط طبقہ کا ہے۔ تیلگو، مراٹھی، بنگالی کی طرح اس کا اپنا لوک ادب نہیں ہے۔ جس سے زبان قوت، مواد اور ذخیرہ الفاظ حاصل کرتی ہے۔ اردو اس سے محروم رہی۔ لیکن اس نے ابھرتے ہوئے متوسط طبقہ کی زندگی سے جو کچھ اخذ کیا اس پر اسے فخر ہونا چاہیئے اس کا آغاز حالی سے ہوا۔ اس طبقہ کے جو سیاسی اور سماجی حوصلے تھے وہ راست انداز سے شاعری کا موضوع بنے۔ غزل میں نئی جان حسرت نے پھونکی ترقی پسندوں نے شہری عوام کی زندگی ذہن اور زبان سے شاعری کو ہم آہنگ کرنے کی جدوجہد کی۔ انھوں نے مقامی کو آفاقی اور تخصیص کو تعمیم کا رنگ دیا۔ انھوں نے بین الاقوامی احساس کو قومی احساس میں ڈھالا۔ ڈاکٹر گوڑ نے کہا کہ آج سرمایہ دارانہ نظام ٹوٹ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں ایک نئے نظام کی کھوج جاری ہے۔ ہمارا نوجوان سرمایہ داری کے ٹوٹے ہوئے آئینہ کے سامنے کھڑا ہے جس میں اسے اپنا مسخ شدہ عکس نظر آتا ہے اس کا حال دھندلا ہے اور مستقبل بھی صاف نہیں اسے صاف اور واضح کرنا ترقی پسند ادیبوں کا کام ہے۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ چالیس سال میں ہم نے جو کچھ کہا ہے لکھا ہے وہ ایک ٹھوس بنیاد ہے آگے بڑھنے کے لئے

کانپور ڈیولپمنٹ اتھارٹی

ٹنڈر نوٹس

"مندرجہ ذیل کاموں کے لیے مورخہ ۱۰ اگست ۷۶ء کو تین بجے سیل کئے ہوئے ٹنڈر تسلیم شدہ ٹھیکیداروں سے مطلوب ہیں۔ ٹنڈر فارم نگر ابھیتا کے دفتر سے اور پبلک ریلیشنز آفیسر کے دفتر سے کسی بھی کام والے دن ایک بجے تک دستیاب ہو سکتا ہے۔ ٹنڈر کے ساتھ ایک فیصدی زر بیعانہ بھی جمع کرنا ہوگا۔ یا کسی بھی شیڈولڈ بینک میں کال رسیٹ پر جمع شدہ رقم جو کہ چیف اکاؤنٹ آفیسر کانپور ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے نام ہو۔ چیک کے ذریعہ زر بیعانہ پر کوئی غور نہیں کیا جائے گا۔ کامیاب ٹنڈروں کو کام کی قیمت ۲ فیصدی زر ضمانت دس دن میں جمع کرنا ہوگی (بشمول ایک فیصدی زر بیعانہ) ٹنڈر منظور ہو جانے کے بعد میں ٹنڈر بھیجنے والوں کو ٹنڈر کھولتے وقت موجود رہنا چاہیے۔ کانپور ڈیولپمنٹ اتھارٹی کو یہ اختیار رہے گا کہ وہ کسی بھی ٹنڈر کو بلا کوئی سبب بتائے نامنظور کر دے!

نمبر شمار	کام	تخمینا قیمت	EM	ٹنڈر کی قیمت	کام ختم ہونے کی میعاد
۱	اندرا نگر میں HUDCO اسکیم میں KGC نالے کی تعمیر اور اینٹوں سے چھانا	90,858/-	RS 909/RS	RS.10/-	دو ماہ
۲	K4C نالیوں اور گلی پٹ کی تعمیر ادہلاک کاکا دیو میں اسکیم نمبر ا	RS 169,715/-	RS 1698/-	RS 10/-	چار ماہ
۳	اسٹریٹ لائٹنگ جی ٹی روڈ کے ساتھ دکشن نمبر 9 سے 150 تک لاڈ انگو میں)	RS 76289/-	RS 763/-	RS 10/-	دو ماہ
۴	برا کے بقیہ حصوں میں سیور بچھانے کا کام HUDCO اسکیم میں	RS 1,79294/-	RS 1733/-	RS 10/-	پانچ ماہ
۵	سوان پور سے سوان پور سرائے تک کی سڑک کا سدھار زون نمبر 5 اسکیم نمبر ایک میں	RS 346263/-	RS 343/	RS 5/-	دو ماہ

"نظم و ضبط ہی ملک کو عظیم بناتا ہے"

دستخط

ایچ این دوبے

(ادھیکشا سی ابھی نیتا)

اظہار۔ انھوں نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ غزل بیانیہ طرز اظہار کی متحمل نہیں ہوسکتی لیکن فیض اور مجروح نے ثابت کردیا کہ غزل کا کینوس چھوٹا ہونے کے باوجود اتنی پہنائی رکھتا ہے کہ اس میں ہر طرح کے تجربات موثر ڈھنگ سے بیان ہوسکتے ہیں

کوثر چاند پوری نے کہا کہ عمیق حنفی کے مقالے نے مایوس کیا۔ ان سے اس عہد کی شاعری کے زیادہ جامع اور زیادہ منصفانہ مطالعہ کی توقع تھی!

حیات اللہ انصاری نے اپنے ان مخصوص اعتراضات کو دہرایا جو وہ ترقی پسند تحریک اور ادب پر کرتے آئے ہیں مثلاً یہ کہ اس تحریک کے رہنما کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اسی لئے یہ تحریک نہ صرف قومی تحریک سے الگ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک سے باہر رہنے والے ادیب ہی قومی امنگوں کی آئینہ داری کرنے والا ادب تخلیق کرسکے ہیں

اختر سعید خاں نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ عمیق حنفی نے جوش پر دعدہ دہنی کا الزام لگایا ہے لیکن میرے خیال میں یہی بات ان کے مضمون کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ ان کا جائزہ ایک رخا اور ادھورا ہے انھوں نے اپنے موضوع اور مقالے سے انصاف نہیں کیا

اختر سعید خاں نے مثالیں دیتے ہوئے کہا کہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک اردو کے جن ادیبوں اور شاعروں نے ملک کے قومی سیاسی اور تحریک آزادی کو اپنے فن کا موضوع بنایا؟ ان میں ترقی پسند ادیب ہی پیش پیش تھے اور آزادی کے بعد ملک کے سامنے جو مسائل آئے خواہ وہ ہجرت اور فسادات ہوں یا اقتصادی اور سماجی آزادی کے مسائل ترقی پسند ادیبوں نے تخلیقی حسن کے ساتھ ادب میں ان کو برتا ہے

ڈاکٹر اجمل اجملی نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ترقی پسند شاعری کا جائزہ لیا جاتا ہے تو تحریک نسبتاً کمزور شاعری کو سامنے رکھ کر فتوے صادر کئے جاتے ہیں ہر شاعر کی طرح ترقی پسند شاعروں نے بھی اچھی اور کمزور دونوں طرح کی شاعری کی ہے ضرورت اس کی ہے کہ جائزہ لیتے ہوئے پوری شاعری کو نظر میں رکھا جائے۔ انھوں نے کہا کہ آج مایوسی، بیزاری اور بے یقینی کی شاعری پر اعتراض کیا جاتا ہے تو جدید نقاد کہتے ہیں کہ آج کے حالات میں جب اقدار اپنا بھرم کھو چکی ہے جب ہر چیز پر سے یقین اٹھ گیا ہے تو اسی طرح کی شاعری کی جاسکتی ہے، میں اس سے اتفاق نہیں کرتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ہماری "نعرہ بازی" کی شاعری پر حکم صادر کرنے ہوئے بھی اس زمانے کے حالات کا خیال رکھا جائے۔ انھوں نے اس اعتراض کا بھی جواب دیا کہ کیا ترقی پسند ادب صرف ۴۰ سال کا ہے کہ اس کی چالیسویں سالگرہ منائی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند ادب ہر دور میں پیدا ہوا ہے، ہم صرف ۴۰ سال کے ادب کا جائزہ لے رہے ہیں اور ۴۰ ویں سالگرہ ہماری انجمن کی ۴۰ ویں سالگرہ ہے، ترقی پسند ادب کی نہیں۔

ڈاکٹر عنوان چشتی نے ترقی پسند شاعری کے بڑے حصے کو راست بیانیہ اور ہنگامی واقعات کی شاعری قرار دیا اور کہا کہ فیض کی شاعری اسی لئے اپیل کرتی ہے کہ وہ رمزیہ پیرایہ کی شاعری ہے انھوں نے کہا کہ جہاں تک ہیئت کے تجربوں کا تعلق ہے جدیدیوں کو اس میدان میں ترقی پسندوں پر فوقیت حاصل ہے

رفعت سروش نے کہا کہ اقبال کی فکری شاعری کو ترقی پسند والے آگے بڑھایا ہے سردار جعفری کی شاعری بڑی فکر کی شاعری ہے انھوں نے کہا کہ مقالوں اور بحث میں طویل نظم میں ترقی پسندوں کے کارنامہ کو نظر انداز کیا گیا ہے

سردار جعفری سلام مچھلی شہری اور دوسرے شعرا نے کامیاب طویل نظمیں لکھی ہیں۔ سید جمال الدین نے کہا کہ ترقی پسند شعرا بالخصوص فیض اور سردار جعفری کے یہاں جہاں فکر احساس میں ڈھل گئی ہے اور نظریہ نظر بن گیا ہے۔ وہاں بلند اور بڑی شاعری وجود میں آئی ہے۔ ہندی کے ممتاز شاعر شمشیر بہادر نے اپنی تقریر میں کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ آج نئی اور پرانی پیڑھی کا تصادم ہے۔ فن کی سطح پر دیکھئے تو اردو ہی نہیں یورپ کے بڑے بڑے شاعر بھی اپنی زبان کی وسعت اور اس کی روایت کا بھرپور شعور رکھتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہوگا کہ نئی پیڑھی کے شاعر کس حد تک اس شرط کو پورا کرتے ہیں

سیمینار کا آخری اجلاس ۱۸ اپریل کی شام کو تین بجے شروع ہوا۔ اس اجلاس کی مجلس صدارت میں عصمت چغتائی قرۃ العین حیدر، پروفیسر محمد حسن، غلام ربانی تاباں اور قاضی عبدالستار تھے اس کا موضوع تھا، ترقی پسند نثری ادب کے چالیس سال اس میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے۔

۱۔ ترقی پسند تحریک اور افسانہ	ڈاکٹر ظفر احمد نظامی
۲۔ ترقی پسند تحریک اور ڈرامہ	سید ضمیر حسن
۳۔ ترقی پسند تحریک اور طنز و مزاح	احمد جمال پاشا
۴۔ ترقی پسند تحریک اور ناول	ڈاکٹر قمر رئیس

ان مقالوں میں ترقی پسند ادیبوں کے یا اس تحریک کے زیر اثر پیدا ہونے والے نثری ادب کا جائزہ لیا گیا تھا وقت کی تنگی کے خیال سے مقالہ نگاروں نے چند خاص رجحانات یا اہم تخلیقات کے ذکر پر اکتفا کیا تھا لفظاً ان کے بعد یہ مقالات جلد ہی شائع کئے جائیں گے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اوپندر ناتھ اشک نے کہا کہ مقالے بھرپور اور جامع نہیں تھے۔ امتیاز علی تاج اور منٹو کا ذکر زیادہ مناسب ڈھنگ سے ہونا چاہئے تھا انھوں نے کہا کہ انگارے کی کہانیوں سے اس تحریک کا آغاز ہوا جس نے ہم سب کو متاثر کیا تھا۔ رتن سنگھ نے کہا کہ آزادی کے چند سال بعد جب میں نے لکھنا شروع کیا تو لکھنؤ میں ترقی پسند ادیبوں کا حلقہ چھایا ہوا تھا ان کی محفلوں میں میں نے اور میری پود کے بہت سے ادیبوں نے بہت کچھ سیکھا۔ ہم نے سوچا کہ آخر آزادی کے کیا معنی ہیں ؟ وہ کس کے لئے ہے ؟ اگر عوام کیلئے ہے تو اس کا رخ اس جانب موڑنے میں ہم کیا رول ادا کر سکتے ہیں ؟ اس طرح کے بہت سے اجتماعی مسائل کی طرف ترقی پسند ادیبوں نے ہماری توجہ مبذول کرائی۔ براج مینرا نے کہا میں احتجاجاً بحث میں حصہ نہیں لیتا ہوں۔ کہا جارہا ہے کہ مشاعرہ کی خاطر کچھ دیر بعد یہ اجلاس ختم ہو جائے گا۔ گویا ایک ڈی جنریٹیڈ ادارہ مشاعرہ اس بحث سے زیادہ اہم ہے۔ قاضی عبدالستار نے بھی انکی تائید کرتے ہوئے کہا کہ میرے نزدیک شاعرے، مجرے اور قوالی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جمال نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند افسانوی ادب میں ترقی پسند قدروں کا احساس انکی اشاعت کس پیرایہ میں ہوئی ہے مقالوں میں اسکی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ انھوں نے کہا یہ تحریک اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہمارے ذہن میں یہ صاف نہ ہو کہ ہمیں کیا پیغام پہونچانا ہے اور کسے پہنچانا ہے۔ شمس الحق عثمانی نے سوال کیا کہ انگارے کے بعد سیاسی مسائل پر لکھے ہوئے کسی ترقی پسند ادیب کے افسانے ضبط ہوئے ؟ انھوں نے کہا کہ بیدی اور قاسمی کے فن کا ورثہ مینرا اور انور سجاد کی کہانیوں میں ملتا ہے لیکن اس کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔!

یوگیش کمار نے کہا کہ مجھے اعتراف کرنا ہے کہ ترقی پسند تحریک نے مجھے بہت کچھ دیا ہے گذشتہ کچھ برسوں سے ترقی پسند افسانے میں کچھ تعطل آگیا ہے۔ لیکن اگر آپ اس سے دلچسپی ہے کہ ترقی پسند افسانے کی روایت آگے بڑھے تو پھر اس سمت میں کوشش کرنا ہوگی۔ عصمت چغتائی نے ہندوستانی عورت کو اپنی دنیا آپ بنانے کا پیغام دیا تھا ان کے یہاں عورت آج کی زندہ بدلتی ہوئی عورت ہے۔ بیدی کی عورت وفا شعاری اور ایثار و قربانی کے جذبات کو چھپا کرتی ہے لیکن اس کا ملنا دشوار ہے

کنہیا لال ذاکر نے اشک کے حوالے سے کہا کہ ناول کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں پچھڑ گیا ہے۔ لیکن اردو افسانے کا معیار دوسری زبانوں کے افسانوں سے کسی طرح پست نہیں۔

انھوں نے کہا کہ نئی پود کے افسانہ نگار مشق اور محنت سے کتراتے ہیں۔ علی جاوید نے کہا کہ قاضی عبدالستار صاحب اردو ادب کے استاد ہیں انھوں نے مشاعرہ کو مجرا کہا جسے ثابت بھی کیا کہ اردو شاعری کو مجرے کے انداز میں پڑھاتے ہیں۔

عصمت چغتائی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ترقی پسند تحریک کو پیدا ہوتے دیکھا تھا اور آج تک اپنے کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ اس کی چالیسویں سالگرہ دیکھ رہی ہوں۔ ہم نے جب لکھنا شروع کیا تو بزرگ ادیب ہمیں گالیاں دیتے تھے اور رسالوں کے ایڈیٹر منت اور اصرار کر کے ہماری چیزیں مانگتے اور چھاپتے تھے۔ لیکن نئی پود کے لوگ اس کے برعکس بزرگوں پر برستے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑتے ہیں۔ ادب پر مقالے لکھے جا رہے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ ادیب کون ہے کیسی زندگی بسر کر رہا ہے۔ کن حالات میں لکھتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں ادیبوں کو طرح طرح کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ ان کے لئے آرام دہ مکانات بنائے جا رہے ہیں میں کہتی ہوں کہ لڑائیاں لڑنا ہے تو بڑی لڑائیاں لڑو۔ حکومت سے مطالبہ کریں کہ ہمیں سارے ملک کا سفر کرنے کی سہولت دی جائے۔ ہمارے لئے آرام گھر ہوں، پبلشنگ ہاؤس ہیں تاکہ ہماری محنت کا استحصال نہ ہو سکے۔ سردار جعفری نے نئی تنظیم کی طرف سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور سیمینار نیز کانفرنس کی کامیابی پر انھیں مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا آئندہ ہم ایسے سیمینار کریں گے جو کسی ایک صنف یا ایک خاص موضوع تک محدود ہوں تاکہ کھل کر بات چیت ہو سکے۔ انھوں نے اردو ادیبوں کے مسائل کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم اس لئے کمزور ہیں کہ ہماری کتابیں ہزار آدھا سو سے زیادہ نہیں چھپتیں۔ ہماری آواز دور تک نہیں پہنچتی ہمیں اپنی کتابوں کی اشاعت اور تقسیم کا کام دیکھنا ہے

آخر میں ڈاکٹر محمد حسن نے کہا کہ نثر کے خلاف تعصب کا شکوہ کیا گیا ہے۔ دراصل نثر کا عروج صنعتی فروغ سے وابستہ ہوتا ہے۔ جیسے جیسے صنعت کاری بڑھے گی نثر کا فروغ ہوگا۔ اور وہ شاعری کے عناصر سے آزاد ہوتی جائے گی۔ انھوں نے کہا مجرے یعنی موسیقی اور رقص بھی فنون لطیفہ ہیں۔ ان کے بارے میں تحقیر کا رویہ کیوں؟ انھوں نے زور دے کر کہا کہ آج کے دور میں ترقی پسندی کی دریافت کے لئے آویزش اور ٹکراؤ ضروری ہے۔ تلخی تندی اختلاف یا انحراف سے گھبرانے کی ضرورت نہیں اس سے نئی ترقی پسندی کی راہیں نکلیں گی

قمر رئیس

توانا اور باشعور ادبی تحریک کا رہنما

احمد ندیم قاسمی

سید سجاد ظہیر کا نام ایک توانا اور باشعور ادبی تحریک کے رہنما کی حیثیت سے مدتوں یاد رکھا جائے گا وہ بنیادی طور پر ادیب تھے مگر ان کا بیشتر وقت سیاست کی نذر ہو گیا اور تخلیق ادب کی طرف متوجہ ہونے کا انھیں بہت کم وقت ملا نوجوانی میں وہ ترقی پسند تحریک کی تنظیم و تشہیر میں مصروف رہے اور اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی سیاست میں ایسے الجھے کہ تخلیقی ادب کا منصب ادا کرنے سے قاصر رہے سجاد ظہیر نے بھی اپنی حیرت انگیز صلاحیتوں کی ترجمانی دے ڈالی یوں تو تاریخ ادب میں ان کا ذکر ایک ادیب سے زیادہ ایک ادبی رہنما کی حیثیت سے آئے گا یہ حیثیت بھی بہت بڑی ہے کیونکہ انھوں نے جس تحریک کا آغاز کیا اس نے نہ صرف یہ کہ گذشتہ ۳۰، ۳۵ برس کے ادب کو بھرپور اور ہمہ جہتی انداز میں متاثر کیا بلکہ آنے والے نسلوں میں ادیب اسی ادبی تحریک سے رہنمائی اور انسپریشن حاصل کرے گا۔

"لندن کی ایک رات" سید سجاد ظہیر کا ایک ناولٹ ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ ناول نویسی اور افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوتے تو اپنا ایک منفرد اسلوب پیدا کرتے مگر افسوس کہ وہ ایسا نہ کر سکے بعد میں انھوں نے چند افسانے بھی لکھے مگر ادبی رہنما کی حیثیت سے جلد ہی ان کا رجحان تنقید کی طرف ہو گیا۔ تنقیدی مضامین میں بھی وہ تحسین فن سے زیادہ ایک ہنگامی منصب کی تکمیل کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں گذشتہ ۱۰ برس میں انھوں نے چند نظمیں بھی لکھیں مگر ان کی حیثیت محض تجرباتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے سید سجاد ظہیر نے اردو ادب میں تجرید کے طوفان سے چونک کر تجرید اور حقیقت کے درمیان کوئی واضح رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش میں یہ نظمیں لکھیں اور تجربے کو جوش میں اوزان و بحور کے ساتھ آزادی برتنے کا تجربہ کیا گر جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ خالصتاً ادبی شغف کے لیے ان کے پاس وقت بہت کم تھا سو اس تجربے کو وہ کوئی ٹھوس صورت نہ دے سکے

ان کا اصل ادبی کارنامہ "روشنائی" ہے جو ترقی پسند ادب کی تحریک اور تنظیم کی روداد ہے یہ کام انہی کے کرنے کا تھا کیونکہ سنہ ۱۹۳۶ء میں جن نوجوانوں نے اس تحریک کا آغاز کیا ان میں سید سجاد ظہیر پیش پیش تھے اور انہی کی جد و جہد سے یہ تحریک ملک گیر ہو گئی تھی روشنائی میں انھوں نے جن حالات و واقعات کو یکجا کیا ہے وہ ہماری تاریخ ادب کا ایک اہم دستاویز ہے کوئی دوسرا ادیب اس موضوع پر اتنی ذمہ داری سے قلم نہیں اٹھا سکتا!

سید سجاد ظہیر کی نثر نہایت سادہ اور سلیس ہوتی ہے مگر اس سادگی اور سلاست میں بھی ایک پُراسرار ادبی فضا ہوتی ہے زنداں سے انھوں نے اپنی بیگم کے نام جو خطوط لکھے اور جو کتابی صورت اختیار کر چکے ہیں وہ بھی خوبصورت مکاتیب کے عمدہ نمونے تھے!

ان کے بارے میں سنا اور پڑھا کہ وہ بہت مہذب اور شائستہ انسان تھے اور دوستوں کے محبوب تھے قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان میں آبسے مگر کچھ عرصہ بعد کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے انھیں انڈر گراؤنڈ ہو جانا پڑا چنانچہ ان لوگوں سے ان کی ملاقات شاذ ہی ہوتی تھی جو پارٹی کے ممبر نہیں تھے میں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا اور ۱۹۵۵ء تک یہ اعزاز میرے پاس رہا مگر پارٹی کا رکن نہیں تھا اس لئے سید صاحب سے میری ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا البتہ وہ جب ۱۹۵۵ء میں راولپنڈی سازش کیس کے سلسلہ میں ۴ سال جیل میں رہ کر رہا ہوئے اور لاہور میں ایک دوست نے انکے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا تو وہ سید سجاد ظہیر سے پہلی اور آخری ملاقات ہو سکی چنانچہ انکی شخصیت کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنے کا حق نہیں بنتا البتہ انکی شائستہ مزاجی کا ایک تجربہ یوں ہوا کہ راولپنڈی سازش کیس سے پہلے جب وہ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے اور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری تھا تو بعض نظریاتی مباحث کے سلسلہ میں انھوں نے مجھے ایک مفصل خط بھجوایا جس کا میں نے مفصل جواب عرض کیا ایک بار پھر ان کا اتنا ہی مفصل خط آیا اور میں نے بھی اتنی ہی تفصیل سے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کی بحث یہ تھی کہ میں حالات و مسائل کو پاکستان کے حوالے سے جانچتا تھا اور یہاں کے لوگوں کے عقائد، تہذیب، اور کلچر کے پس منظر کے بغیر کسی بھی منظر کو قبول کرنے پر رضامند نہیں تھا یہ انداز نظر شاید اس تھیوری کے خلاف تھا جس کے سید صاحب علمبردار تھے چنانچہ خطوط میں انھوں نے مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش کی اور ادھر میں کوشاں رہا کہ وہ ایک ایسے ادیب کا نقطۂ نظر سمجھ لیں جس نے تحریک پاکستان میں عملاً حصہ لیا تھا اور جو اس مملکت کی تہذیبی جواز پر ایمان رکھتا ہے ظاہر ہے کہ اس طرح بحث کے تلخ ہو جانے کا امکان تھا تب بھی وہ دور انتہا پسندی کا تھا مگر مجال ہے کہ اس بحث کے دوران سید صاحب کے لہجے میں تلخی یا درشتی کا شائبہ بھی پیدا ہوا وہ تلخ سے تلخ حقائق کا اظہار بھی نہایت سلیقے سے کرتے تھے افسوس کہ یہ خط ایک مدت سے ضائع ہو چکے ہیں۔ اگر محفوظ ہوتے تو ترقی پسند ادب کی تحریک کے سلسلہ میں بعض نظریاتی الجھنوں کے حل میں بہت عمدہ ثابت ہو سکتے تھے۔ مجھے اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ جب ۱۹۵۱ء میں سید سجاد ظہیر گرفتار ہوئے تو خانہ تلاشی میں پولیس کو ان کے نام میرے یہ خطوط بھی دستیاب ہوئے جن پر قبضہ کر لیا گیا اور انھیں انگریزی میں منتقل کر کے پولیس کے حکام اعلیٰ کی خدمت میں پیش کیا گیا جو ان کا تجزیاتی مطالعہ کرتے رہے رہے وہ خطوط جو سید صاحب نے میرے نام لکھے تو تلاش بسیار کے باوجود وہ مجھے نہیں مل سکے شبہ ہوتا ہے کہ میری خانہ تلاشیوں کے دوران وہ بھی خفیہ پولیس کے ریکارڈ میں چلے گئے ہوں گے!

ظ۔ انصاری
۲۲ - شیریں مارکٹ
بمبئی ۵

بنّے بھائی

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اس پھیلی ہوئی دھرتی پر ہر طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ کہیں کوئی ایسا نہیں جیسے بنّے بھائی تھے میں نے ان پر ۱۹۶۰ء میں ایسا بیہودہ مضمون لکھا، گوارا اور ناگوار کا یہ مرکب انھوں نے دیکھا۔ چہرے پر ہلکی سی تبسم کی شکن بھی ابھری۔ تین چار سال بعد انھوں نے صاف گوئی اور تجزیے کی داد دی اور کہنے لگے کہ اگر اپنے ہمعصروں پر ایسے ہی پندرہ بیس شگفتہ سے خاکے لکھ دو تو ہم مان جائیں

کیا عالی ظرف صاحب نظر ہم میں سے گم ہو گیا ہے
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

پڑھنے والے ان سطروں کے کانٹے چن کر ہی اس دلنواز اور بھرپور شخصیت کا مطالعہ کریں تو بہتر ہے

(ظ۔ انصاری)

اب سے کوئی تین برس پہلے ایک زمانہ تھا جب جواہر لال نہرو زندہ تھے اور ملک کے اچھے اچھے بکھیڑ چھانٹ کر اپنے اٹھے آنند بھون (الٰہ آباد) پر جمع کر رہے تھے۔ انھوں نے سر وزیر حسن کے کمیونسٹ بیٹے سید سجاد ظہیر کو جو انگلینڈ سے کمیونسٹی اور بیرسٹری پاس کر کے آیا تھا، اپنے دلبرانہ تبسم سے لبھا کر کانگریس سوشلسٹ فرنٹ میں کھینچ لیا۔ ہندوستان میں غلامی اور غریبی کے درد سے بھرے ہوئے وہ جنوں حوصلہ مند دل اور بشاش چہرے اس صف میں کھڑے ہوگئے جب کے جیل کے پھاٹک اور ہندوستان گیر شہرت کے پلیٹ فارم یکساں فیاض تھے ان میں سے کسی ایک کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ممبری اور ایک سیاسی، سماجی یا کلچرل فرنٹ کی ذمہ داری سپرد ہوئی یکبر اشرف، آچاریہ، نریندر دیو، رام منوہر لوہیا، ڈاکٹر زیڈ اے احمد اور سجاد ظہیر اسی دور میں نمایاں ہوئے اور جب چھٹ کر الگ ہوئے تو کوئی جواہر لال کے دم سے وزارت کے محل تک پہونچا۔ کوئی پردیسی میں عمر کے دن کاٹ گیا۔ کسی نے آل انڈیا پارٹی کی بنیاد ڈالی اور موتی لال نہرو کے خاندان کو ہی خصوصیت سے اپنا نشانہ بنایا۔ اور کسی نے کھل کر کمیونسٹ پارٹی کو اپنے جان و مال کا اختیار دے دیا۔ یہ بنّے بھائی تھے۔ وہ ایک مرنجان مرنج، قناعت پیشہ، ہر حال میں خوش رہنے والی قسم کے آدمی آج بیس سال بعد بھی اسی طرح وفادار، بشرطِ استواری کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ داہنی طرف کمیونسٹ پارٹی ان کی مسجد ہے اور ترقی پسند مصنفین کا امام باڑہ۔ عبادت میں یکسوئی اور نذر و نیاز میں وضعداری ان کے کردار کا بنیادی عنصر ہے

وہ اپنے سلجھے ہوئے شعور کی ہمراہی میں جس دامنِ دولت سے وابستہ ہوتے جس خانقاہ کی سجادہ نشینی پر کمربستہ ہوتے اسے اتنے ہی خلوص اور لگن سے نباہ جاتے کسی پارٹی اگروہ یا حلقے میں شامل رہنا (ان کے بعض ہم عصروں کی طرح) نہ تو کبھی مصلحت کا تقاضہ ہے نہ کوئی الو نکالنے کا ذریعہ وہ انجمن آرائی کے لئے بنے ہیں اور انجمن کے بغیر جی نہیں سکتے تھے

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ بھی نہیں

کسی فرنٹ میں ان کا آگے آگے نظر آنا دشمن کی دشمنی سے نہیں دوست کی دوستی سے سروکار رکھتا ہے جنگی یا انتقامی کارروائی نہیں پختہ سماجی شعور کی پیداوار اور مزاج کی افتاد کا نتیجہ ہے جن کو آدمی کے باطن میں اترنے والی نگاہ میسر ہوئی ہے ۔ وہ سجاد ظہیر جیسی شخصیت کے اندر آسانی سے جھانک کر دیکھ سکتے ہیں کہ تبرائی نہیں تولائی طبیعت کے آدمی ہیں ۔ طبقاتی کش مکش کا فلسفہ بھی ان کی سمجھ میں اس لئے جڑ پکڑ گیا ہے کہ وہ ہمارے سماج میں پاپ پیدا کرتی بہت چھوٹی موٹی نفرتوں اور کمینگیوں سے فکر انسانی کو آزاد کر دیتا ہے

گر یہ بات جو میرے منہ تک آگئی ہے اتنی سیدھی نہیں ۔ اسے ذرا اور کان لگا کر سننا ہوگا ۔

ہزار نکتہ درین کار و بار دلداری ست

مذہبی ماحول ۔ بعض سچائیاں نادان بچوں کی طرح توتلی ہوتی ہیں ۔ اسی طرح کی ایک توتلی سچائی یہ ہے کہ شیعہ دہریہ ہو کر بھی شیعہ رہتا ہے ۔ ڈاکٹر اشرف مرحوم چھیڑا خانی کیا کرتے تھے کہ شیعہ کمیونسٹ محرم کی مجلس سے باز نہیں آئے گا ۔ جینا تو رہا ایک طرف مرنے کا ذکر تک ان لفظوں میں کرتا ہے ۔

ہم یوں سبیل ہو کے یہاں جی لئے بہت
یارو ! حسین بن کے بھی مرجانا چاہیئے

بنے بھائی لکھنؤ کے ایک خوش حال اور ذی اثر شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے پلے بڑھے رائٹ آنریبل سر وزیر حسن کے گھر سات بیٹوں ، بیٹیوں میں وہ چھٹے تھے ۔ کھرچن سب گھر والوں کو عزیز ہوتی ہے ۔ یہ بھی اپنے ماں کے سب سے لاڈلے بیٹے تھے ۔ احتیاج کا بھیانک روپ جو بہتوں رومی شیر کو لومڑی بنا دیتا ہے ۔ انھوں نے اپنے گھر میں نہیں دیکھا ۔ گھر میں اردو فارسی پڑھانے والے مولوی صاحب کی کرخت آواز اور تختی کے سوا کسی چیز سے ڈرنا نہیں پڑا ۔ حسین کی بھوک پیاس کے علاوہ کسی غم پر ٹوٹ کر نہیں روئے خوف اور احتیاج سے جو آزادی ان کو اپنے گھر پر نصیب ہوئی وہ بعد کی روپوش سیاسی زندگی اور پھانسی کے سلسلے میں رہ کر بھی رفاقت کا دم بھرتی تھی یہ اطمینانِ قلب ان کے کردار کا اہم حصہ ہے

مذہبی آزادی کے ماحول نے انھیں مولویت کے کٹر پن اور بے رحم اصول پرستی سے اتنا ہی پاک رکھا جتنا بے اصولی اور اکی قیمت آزمائی سے ۔ یہ ماحول تھا اودھ کی شیعیت کا

عرب کے خالص اسلام کو آریائی نسلوں نے اپنی بعض نسلی خصوصیات اور تہذیبی سرگرمیوں کا رنگ دیا تو شیعیت اور تصوف دونوں تحریکوں نے زور پکڑا اور شیعیت کے روپ میں سامی عرب اور وسط ایشیائی قبیلوں کی شدت اور حدت کا اثر اسی طرح زائل کر دیا ۔ جس طرح حافظ شیرازی اپنی خوراک معتدل کرنے کیلئے بادۂ حقیقت میں مجاز کی زعفران گھول لیتے

یا غالب بادۂ صافی میں عرق گلاب ملا لیتے تھے

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئے اوست

آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

بادۂ صافی کا آمیختہ ہندوستان کے متمدن اور خوش حال خطوں میں بہتر اور بھی زود اثر ہوگیا۔ اس لئے یہاں کی تہذیبی کوشش پہچان کر یکجا کریں، مسلمانوں کے متوسط طبقے، زمیندار، ملازمت پیشہ اور تعلیم یافتہ حلقوں میں شیعیت خطوں کے ابتدائی دولت سے عام ہو رہی تھی۔ اودھ اور برج بھاشا کی رام اور کرشن کے بھجن گاتی ہوئی سرزمینوں میں اسے سیاسی طاقت بھی میسر آگئی لازم بات ہے کہ ملک کے تہذیبی ورثے میں اس نے اپنے دعوے سے بڑھ کر حصہ پایا اور نتیجہ میں ہند ایرانی فنون کے ہر ایک سرچشمے سے جی بھر کر فیض اٹھایا

ہندوستان اور پاکستان کے مسلم متوسط طبقے میں آج بھی کہیں کہیں سیاسی مقام پہ دیکھا جا سکتا ہے کہ شیعہ نوجوانوں میں حق آسانی، ذہانت اور وسیع النظری عام ہوتی ہے۔ مذہبی عقائد سے آگاہی لیکن انکی بجا آوری سے نسبتاً بے پروائی، فنون لطیفہ کا احساس عموماً زیادہ نازک زبان و بیان کا ذوق، اپنے ہم سنوں سے کہیں زیادہ تربیت یافتہ اور قبولیت کا مادہ بڑھا ہوا

سید سجاد ظہیر کی روپ رکھا اسی طرح ایک دار شیعہ ماحول میں بنی اور بنتے بنتے وہ شین اسی طرح مسلک کے دائروں سے پہلی گئی جس طرح انکی شخصیت کے بیان میں شیعیت کے تذکرے کا یہ ایک پہلو نامبسنے اپنے حق سے زیادہ جگہ گھیر لی ہے۔ انکی دہریت کا تعلق تو بھی سے ٹکراؤ نہیں تھا۔ بلکہ کمیونسٹ کٹر پن کو شیعی لوچ اور مروت پسندی زیادہ قابل قبول بنا جاتی ہے

ارسٹاکریسی :۔ سجاد ظہیر کی اٹھان بڑی حد تک جواہر لال نہرو کی طرح ہوئی۔ باپ معتدل اور لبرل سیاست کے علمبردار گھر میں خوش حالی، دوست احباب نہایت تعلیم یافتہ خوش پوش اور خوش باش، حوصلہ مند اور متناسب شخصیت کے جواہر لال نے ساری عمر اس کشمکش میں گذار دی کہ گاندھیائی پریم پر اسمی چلتی رہی اور مارکسی سوشلزم سے بھی لو لگی رہے۔ کمیونسٹ تحریک میں تیس برس گذارنے کے بعد بھی سید سجاد ظہیر جواہر لال کے مداح اور عقیدت مند رہے تو کچھ بے وجہ نہیں رہے۔ راولپنڈی سازش کیس میں انھیں گرفتار کیا گیا (۱۹۵۱ء) میں تو دکیل سرکار نے پھانسی کی سزا تجویز کی تھی۔ بچپن کے دوست افتی میاں (افتخار الدین) اور چند احباب کے علاوہ ظہیر کی دنیا کو قطعاً خبر نہ تھی کہ لاہور کی سفاک جیل میں ان پر کیا گذر رہی ہے۔ جب سیاسی حالات نے پلٹا کھایا (۱۹۵۵ء) میں وہ چھوٹ کر ہندوستان آگئے۔ جواہر لال سے ملنے گئے کوئی گھنٹہ بھر تنہائی میں باتیں ہوتی رہیں

"اچھا تو بنّے میں پنت جی (ہوم منسٹر) سے بات کروں گا تم یہیں رہ جاؤ اور کچھ کام کرو۔"

"ہاں پنڈت جی میں بھی یہی سوچتا ہوں"

مہینہ بھر نہ گذرا تھا کہ جواہر لال نے بھارت سیوک سماج کی آل انڈیا کونسل سے ان کا نام منتخب کر دیا کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سکریٹری، ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی کمیٹی کے ممبر فوجی سازش کیس کے ملزم اور کمیونسٹ خانقاہ میں رہتی برہما بسر کرنے والے بنے بھائی بھارت سیوک سماج کی آل انڈیا کونسل میں اطمینان و نیک نیتی کے ساتھ نظر آنے لگے۔ بصیرت ہو تو آدمی دیکھ سکتا ہے کہ اس میں تعصب یا بہروپ کا دخل نہیں۔ بعض رواداری، وسعت نظر اور ہمدردی کا تقاضہ

جو انھیں ہر محفل میں مقبول بنا رہا ہے ۔ اور زبان طنز کا مقتول بھی

راولپنڈی سازش کیس ۔ چار برس سے اوپر وہ پاکستان کی جیلوں میں پابہ زنجیر گھمائے گئے ۔ سلطنت خداداد ہیں اور وہ بھی ایسے الزام میں جو کچھ بھی گزر رہا ہو قائم تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے انھیں نوجوانی میں "لندن کی ایک رات" ۔ اور اس کے بعد "انگارے" تک افسانے لکھتے وقت یکی کی جو زندگی میسر تھی وہ میسر نہ ہو سکی، برسوں کی جانگسل دوڑ کے بعد پھر جیل میں ہی نصیب ہوئی ۔ جواہر لال کی ہمہ گیر تصانیف جیل کے دنوں کی یادگار ہیں ۔ بنے بھائی نے بھی جی بھر کر قلم سنبھالا ۔ بیوی کو دل نواز خط لکھے ۔ جو اکیلے دم لکھنؤ میں زندگی کی گاڑی ایک پہیے پر کھینچ رہی تھیں ۔ اسی زمانہ میں انھوں نے "ذکر حافظ" لکھ کر خلوت گاہ شعور سے پردہ اٹھایا ۔ "روشنائی" میں اپنی یادداشتیں جمع کیں جو بہت سے نئے پرانے چہروں کا البم ہے ۔ جیسے البم فرانسیسی رئیسوں کے خانوادوں میں محفوظ رکھے جاتے ہیں !

ظ ۔ انصاری ! غزل کے خلاف تمہارا مضمون رضیہ نے بھیجا تو تم جانو جیل میں ہر
چیز غور سے پڑھی جاتی ہے ۔ مجھے غصہ آگیا ۔ کیا کفر بکا کرتے ہو؟ غزل کی
بہتات سے خیر ہم کو بھی ابکائی آتی ہے ۔ لیکن حافظ کے متعلق ایسی سرسری
رائے ۔ لاحول ولا قوۃ !

جب شام کی تاریکی میں تین مورتی پر جواہر لال نہرو کے پھاٹک سے ہم دونوں باہر آئے (۱۹۵۶) تو سامنے کسی انگریز فاتح کا ایک دراز قد جالی بت کھڑا تھا ۔ اسی روز صبح کے اخباروں میں شہ سرخی تھی کہ شرق اردن کے نوجوان شاہ حسین نے عرب لیجن کے انگریز سپہ سالار گلب پاشا کو بے اختیار کر کے ملک سے باہر نکال دیا ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے اب تک یہ مغربی ایشیا کا نہایت اہم واقعہ تھا بنے بھائی حافظ کی غزل اور جواہر لال کی دلجوئی سے ایک دم پھر گئے

ارے دیکھا ! تم نے انگریز کا کتنا بڑا بت گرا ہے گلب پاشا گیا ۔ میں کہتا ہوں کہ جمال عبدالناصر کی شخصیت کا اثر پھیل رہا ہے ۔ عربوں میں !

"کیوں بنے بھائی آپ نے کبھی سوچا ہے ۔ کہ اگر پنڈی فوجی سازش کامیاب ہو جاتی تو لیکچر ٹنگ میں سوشلزم تو کیا آتا ۔ مصر کی ناصر جیسی حکومت قائم ہوتی پاکستان میں !"

"ہاں بھئی ناکامی کو سازش کہتے ہیں اور کامیابی کو انقلاب یہی دنیا کی ریت ہے" ۔ اتنا کہا اور چپ ہو گئے سوچ میں !

برسوں بعد مجھے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے ایک رہنما (مرحوم) کی زبانی معلوم ہوا کہ بنے بھائی شروع سے اس منصوبے کے خلاف تھے ، منصوبے والوں نے انھیں بعد میں چونکہ پیچھے مشورہ کرنے بلایا ضرور لیکن ان کے سیاسی شعور اور قوت فیصلہ نے سازش کے تصور کو پسند نہیں کیا ۔ ابھی کھچڑی پک ہی رہی تھی کہ خدا اسے جل جلالہ کے ایک پاکباز بندے نے نیکی کے زعم میں اس کا ڈھکنا اٹھا دیا ۔ قصوروار بے قصور سب دھر لیے گئے ۔ اندر پہنچ کر بعض کی طبیعت ایسی بدلی کہ درگاہ باری میں سجدوں پہ سجدے شروع کر دیے ۔ فیض احمد فیض نے "دست صبا" اور "نقش فریادی" کی الاپ کو برہا راگ میں بدل ڈالا ۔ سجاد ظہیر اپنے اس کام میں لگ گئے جس کے آثار انھوں نے اپنی سب سے امید افزا اور قیمتی تحریر "لندن کی ایک رات" میں ظاہر کیے تھے اور جسے وہ طاق نسیاں پر رکھ کر کتابوں کی "مقدمہ بازی" اور پمفلٹ نگاری میں پڑ گئے تھے ۔

نظر ہیں ان کے قابل قدر کارنامے چند تنقیدی مضامین کے علاوہ یہ دو مختصر سی کتابیں "انگارے" اور "لندن کی ایک رات" ہیں پہلی وہ جذباتی عمر کی تحریریں ہیں۔ لیکن جوش کے باوجود ان میں کسک اور سادگی ہے۔ اسٹائل ، پلاٹ اور کہانیوں کی بناوٹ نوجوانی کی تازگی اور مہک لیے ہوئے۔ وہ مہک ان کے زندہ دلوں میں آج بھی باقی ہے لیکن اس طرح جیسے مولسری کے پھولوں کی خوشبو ایک کونے میں دوپہر بسر کرلینے کے بعد مہک تو ہے تازگی نہیں

"ذکر حافظ" اور "روشنائی" جس کا بہت چرچا ہوا سجاد ظہیر کے مطالعے اور مزاج کی ہمہ گیری، وسعت نظر اور حیثیت ہے کہنہ کا نمونہ ضرور ہیں۔ لیکن اہل قلم کی حیثیت سے ابتک جو مقام ان کا ہونا چاہیئے وہاں تک نہیں پہنچا تیں

ایک بار کہیں ہوائی اڈے پر مل گئے۔ میں باہر جا رہا تھا۔ وہ آرہے تھے۔ چند منٹ میں کافی پیتے پیتے انھوں نے اصرار کیا کہ ہندوستان کے فلسفے اور کلچر پر دو نئی کتابیں آئی ہیں۔ لندن سے پہلے آنا اور پڑھنا مت بھولنا۔ ہمیشہ ان سے مل کر کوئی آگاہی یا امید ملتی تھی۔ بار بار مجھے ایک اخبار نکالنے یا کسی اخبار کو لے کر اسے سدھارنے پر اکسایا کرتے!

اول روز سے ان کا واسطہ اخبار نویسی سے رہا۔ بہتیرے اخبار نکالے اور نکلوائے۔ ان کے لیے جگر لنگوٹا کس کر کام بھی کیا اپنا پیسہ اور پسینہ بہایا۔ لیکن یہاں بھی ان کو شہادت کا رتبہ حاصل نہ ہوا۔ جیسا محمد علی جوہر یا ظفر علی خاں کو موسیقار پرندہ۔ عمر دو روزہ میں ایک ہی راگ نکالتا ہے حلق سے اور اسکی چنگاری سے جب گھونسلے میں آگ لگتی ہے تو اندر سے موسیقار کی خاکستر نکلتی ہے۔ اسے کہتے ہیں شہید یک نفس۔ نوجوانی کے والہانہ عشق سے لیکر آج جدید نثر کی شاعری تک جتنے کام وہ کر چکے ہیں سب میں

تاثر برقرار رہی ہے لگن رہی ہے۔ تاہم کوئی ایک شے ہے بیدا نگی اور جارحانہ طولے تام کی جو سجاد ظہیر کی شخصیت سے نباہ نہیں کرتی اطمینان قسطوں میں شہید ہوتا گیا ہے۔ تلاش تلاش کرکے خود کو اٹھا کوئی ان سے سیکھے

اے پیغمبروں کے خدا! یہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں کس قدر معصوم ہوتی ہیں لیکن کیسی جان لیوا کہ کوئی بہت بڑی بڑی آدمی کے وقت کو یوں چپکے سے ذبح نہیں کرتی جتنی یہ ننھی بے ضرر نیکیاں

وضعداری، اطمینانِ قلب

۔ رکشا والا باہر کھڑا ہے ریزگاری کے انتظار میں

۔ رکشا کی سواری یعنی ڈاکٹر رشید جہاں، لکھنؤ کی دلنواز شخصیت، .... جلدی قدم بڑھاتی ہوئی اندر پارٹی آفس میں داخل ہوتی ہیں!

۔ بنّے تمہارے پاس سکے ہوئے پیسے ہیں، چار آنے نکالو جلدی سے

مخاطب نے اطمینان کے ساتھ جیب سے ہاتھ نکالا اسے صاف کیا پھر دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا جیب سے بٹوہ نکالا اس کی تہہ کھولی پھر ریزگاری والی تہہ میں انگلی ڈالی کہ

۔ یہی تو ہے تمہاری تن آسانی انیسویں کی سی چونی نکالنے میں آدھا گھنٹہ کر دیا۔ اسی دن کو تم سے پیسے نہ نکلوا دی نہیں کا کام نہ کے ... وہ پاؤں پٹختے ہوئے دوسری طرف چلی گئیں

۔ وجودک ذنب (تیرا وجود ایک گناہ ہے)

یہ تصور بعض صوفیا نے ہند و فلسفے کی اس شاخ سے لیا جسے ویدانت کہتے ہیں۔ وجود سے مراد یہ مایا جال ہے جس میں فرد کی بے معنی دوڑ جاری ہے اور آدمی جس قدر اس دوڑ میں شامل ہوگا اتنی ہی وہ روپ بدل بدل کر اس چکر میں جکڑا ہوا مجنونانہ انداز گردش کرتا رہے گا۔ ویدانتوں نے اس کا توڑ نکالا......

عالمانہ بے عملی میں وجود گناہ ٹھہرا تو عمل یا کرم اس گناہ کا محرک قرار پایا۔ عالمانہ یا عارفانہ بے عملی فرد کی روح کو ناقص پیر رسے کی طرح نکال پھینکتی ہے تو روحِ جزوی روحِ کلی میں یا قطرہ دریا میں شامل ہو جاتا ہے پھر نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اگر سجاد ظہیر مولانائے روم کی مثنوی سے پہلے کہیں حضرت بیدل شیراز میں پیدا ہو گئے ہوتے تو انکی عارفانہ بے عملی اپنا فلسفہ خود تلاش کر لیتی مشکل یہ کہ انھوں نے ہر پہلو بھرپور زندگی بسر کرنے سے پہلے ہی ترک ترک (کسی لذت یا ترغیب سے ہاتھ اٹھا لینے کا خیال ہی دل سے نکال دینے) کی منزل میں جا ٹنگ لگا دی لندن میں پیدا ہوئے DAS KAPITAL اور منظم مزدور تحریک کی ولادت کے بعد اس لیے چاروناچار انکی شخصیت ایک میل ہو گئی۔ لکھنؤ کی چھپی ہوئی پھولدار اور نفاستی ساخت کا ان کے کردار کی استواری کا جتنا احترام وائٹ بلوم کے ادبی حلقوں میں کیا جاتا ہے۔ اتنا ہی انکی عادات اور مجبوریوں کو رعایت کے قابل سمجھا اور ان پہ مسکرایا جاتا ہے

ان حالات میں شادی ہوتی تو بنے بھائی کے لئے ایک اقلیم - جام شربت - مصرعہ بانو پر شعر ان عشق نے کر دیا کے ساٹھ سال تجربہ ہو چکا
پڑتا - مگر بیوی آپ جانئے بیوی ہوتی ہے جس کے متعلق الہ آباد والے اکبر کہہ گئے ہیں

اکبر ڈرے نہیں کبھی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

• بنے بھائی اب میں رخصت ہوتا ہوں - آدھی رات ہونے آئی ہے
• نہیں بھئی ہمارے گھر تک چلے چلو وہیں سو رہنا
• سونا کیسا آپ تو صبح سویرے اٹھا اور روانہ ہو جائیں گے ۔
• روانہ ہونے سے پہلے رضیہ کو بھی اٹھانا پڑے گا - تم ذرا کہہ دینا کہ دلی تک جا رہے ہیں دو تین دن میں آجائیں گے ۔
اطمینان کرا دینا ورنہ وہ میری گاڑی چھڑوا دیں گی - عورت ہے سمجھنی ہی مشکل ہے

میرے پاس روٹھے میاں بیوی کو منانے اور ملانے کا ایک نہتری نسخہ ہے جو فی سبیل اللہ دوسروں پر استعمال کرتا ہوں سو وہ
یہاں بھی آزمایا - اور رضیہ آپا کو بیچارے بنے بھائی کی ذمہ داریوں پر اتنا ترس دلایا کہ نہ صرف انھوں نے بمبئی سے دلی تک ہو آنے کی اجازت
دے دی - بلکہ دن کا باسی کھانا رات کے دو بجے گرم کر کے ہم دونوں کو کھلا بھی دیا

ایسے کثیر الاحباب مودے کی بیوی بنکر رہنا اور دس کے بچے پال کر انھیں اپنے پاس کر دینا بڑے دل گردے کا کام ہے
اگر قدرت کے کسی کرشمے سے دونوں میاں بیوی نے آپس میں جگہیں بدل لی ہوتیں تو بنے بھائی میں پل جاتے

بنے بھائی کو دیکھ کر بلکہ ان کا تصور کر کے مجھے سیر چشمی اور عالی ظرفی کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے ان کے بعد میں انسانیت
اور شعر ادب میں ایک وقار ہے - اس خوش خصال، خوش وضع اور خوش باش آدمی کی شخصیت ایک زمانے تک مقبولیت اور محبت کے گلدستے
گلدستے پیوست کے بعد آپ روز بروز نزاعی مسئلہ بنتے جا رہے ہیں نزاعی مسئلہ بنانے میں انکی سفید بالوں والی جدید شاعری کو دخل ہے اور اس بات
کو بقول شخصے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے ان کی چاہ ایک مزار شریف اور سجادہ نشین کے تعلقات میں تبدیل ہو گئی ہے

حقیقت پر غور کیا جائے تو آل انڈیا انجمن کا تصور اس کے مینو فسٹیو کی بنا تک ! اسے بنے لئے شہر و شہر گھومتا اور ایسی تحریک کھڑی
کر دینا جس کا اثر کم و بیش ۱۰ سال تک نوجوان پیاسے ذہنوں کی تربیت کرتا رہا ہے، بڑی حد تک سجاد ظہیر کی ایک ایسی تالیف ہے جسے ان کی
ادبی اور علمی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جانا چاہیئے - اگر وہ اسے چند رفیقوں کی مدد سے قائم رکھنا ، تازہ کرنا اور آگے بڑھانا چاہتے
ہیں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے وہ اپنا حق ادا کر رہے ہیں ان سے حق طلب کرنا اور ملنے کے احساس پر انکی نیت کو نشانہ بنانا بے محل بات ہے
کم از کم موزوں طبع اور خوش کلام ہونے کی بدولت شاعر بن گئے اور شاعری کی بدولت پابہ زنجیر رہ گئے ورنہ شخصیت کے اعتبار سے اس قدر مخلص
ہوئے ہیں کہ انھیں روزناموں کی سرخیوں سے بھی سروکار نہیں ہوتا بنے بھائی کے ساتھ شاعری نے الٹا سلوک کیا ہے، پہلے تک کی عقبیت
کو گھن لگا دیا !

بنے بھائی نے پچاس برس تک دنیا کی بہترین زبانوں کی قدیم و جدید شاعری کا رس پینے کے بعد خود شاعری شروع کر دی
تو وہ شخص جسے ہماری زبان کا بلینسکی ہونا تھا - جو گرتے ہوؤں کو سنبھالنے اور سنبھلتے ہوؤں کو آگے بڑھانے کی عالی حوصلگی رکھتا تھا ، اپنی

مقبولیت کو ذہانت، طنز کے مد برد ملے آیا ۔ اسکی بات کا وزن کم ہونے لگا اور آج مشاعرہ باز شہروں میں ایسے کھلنڈرے بینکروں کی کمی نہیں جو اسکی شاعری کی طرح اس کے تعلقات اور شخصیت کو بھی وزن اور آہنگ سے عاری سمجھتے ہیں

سائز اور نمائش کے لحاظ سے شاعر کی طرح سانپ کی بھی بہت سی قسمیں بتائی جاتی ہیں ۔ لیکن ابھی تک غالباً سانپ کی کسی ایسی قسم کا سراغ نہیں لگا جو بعض اہل قلم کی طرح پیٹ بھرے ہوتے پر پھنکاریں مارتی پھرتی ہو اور شہسواروں کی راہ روک کر ان سے اپنا حق دودھ کا پیالہ طلب کرتی ہو ۔ انجمن، جدید شاعری اور سجاد ظہیر کا باہمی رشتہ آج کل طبع آزمائی کے لئے مصرعہ طرح بنا ہوا ہے حالانکہ شاعری کی اس صنف کے متعلق خود موصوف کا رویہ ہے جو ان کے روزمرہ کا موقف ہے

.... مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں اگر کوئی شاعری کے
متعلق اپنی روایتی تصورات سے مجبور ہو کر ان نظموں کو نثری
شعر کہتا ہے میرا اپنا خیال ہے کہ اصلی اور اچھی شاعری بحر وزن
یا قافیہ کی پابندی کے ساتھ بھی کی جا سکتی ہے اور کی گئی ہے اور
ان کے بغیر بھی ...

یہ اس شعری مجموعے کے دیباچے کے الفاظ ہیں جس پر صاف سیدھے خطوط میں لکھا ہے " پگھلا نیلم " خود ان کے قریبی دوستوں سے انھیں وہ داد نہیں ملی جسکی انھیں توقع تھی پھر بھی حسب معمول سید سجاد ظہیر نے ان میں آزمائیوں کے سامنے ہار نہیں مانی ہے

۔ کیوں فیض صاحب آپ نے کچھ نہیں فرمایا " جانی کی اس تازہ نظم پر؟
۔ میں خود تجربہ کر رہا ہوں ۔ مجھے کچھ نہیں کہنا
۔ مطلب یہ کہ وزن اور آہنگ پر کچھ
۔ آہنگ تو اچھی نثر کے لئے بھی اسی قدر لازم ہے ۔ انگریزی ادب دیکھو بحر و وزن کا سوال تو شاعری کے لئے ظاہری وزن کی کیا قید ہے ۔
۔ یہ قید نہ ہوگی ۔ کوئی اور قید ہوگی آزاد سے آزاد فنکار بے قید و بند نہیں ہوتی

میری زبان سے اتنا سنا اور فیض صاحب جو مخاطب کا ہر جملہ اپنے شانوں پر سے پھسل جانے دیتے ہیں چونک گئے

سید جعفر عباس

سجاد ظہیر بحیثیت شاعر

"پگھلا نیلم" سجاد ظہیر کا ایک ایسا مجموعۂ کلام ہے جو شاعری بھی ہے اور نہیں بھی جیسا کہ موصوف نے خود دیباچہ میں اپنی شاعری کے متعلق لکھا ہے! جسے یہاں نقل کرنا بہت ضروری ہے

"میری ان نظموں میں شعریت تو یقیناً ہے لیکن انھیں نظم نہیں کہنا چاہیئے اس لئے کہ ان میں نہ صرف روایتی بحروں کو نہیں برتا گیا ہے لیکن ان میں سے بیشتر میں اوزان اور ارکان کی بھی وہ پابندی نہیں رکھی گئی ہے جو کہ آزاد نظموں میں ہوتی ہے

آگے چل کر وہ پھر لکھتے ہیں "میرے نزدیک اصل سوال یہ ہے کہ شعر یا شاعری کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شعر کی ہیئت تو وہ جسد ہے جس میں شاعری کی روح ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ جسد بغیر شعر کی روح ہو تو وہ شعر نہیں ہو سکتا۔ ہمارے یہاں اسکو تک بندی کہتے ہیں

اس کے معنی یہ ہوئے کہ شعر کی ہیئت کی اہمیت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ شاعری کی روح کے ساتھ وابستہ ہو شعر کے الفاظ اور معنی فنی تخلیق کا وہ خام مسالہ ہیں جس سے کہ ایک شاعر ایک ایسے نئے اور نایاب حسین اور لطیف پیکر کی تخلیق کرتا ہے جو ہمارے ذہن اور احساسات، جذبات، شعور پر ایک قسم کا اثر ڈالتے ہیں

"پگھلا نیلم" جس وقت منظر عام پر آئی تھی تو اس وقت یہ کتاب بحث کا موضوع بن گئی تھی اسکی وجہ شاید یہ تھی کہ اردو میں جدید شاعری کے نام پر جو کچھ تجربے ہو رہے تھے اسکی داغ بیل تو دراصل "حلقہ ارباب ذوق" کی انجمن سے پڑ چکی تھی جس میں میرا جی، ن۔ م۔ راشد، یوسف ظفر اور اس قسم کے دوسرے شاعر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے ادب میں جنسی بے راہ روی جنسی آزادی اور دوسری نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو چکے تھے اور ایک طرح سے یہ سب لوگ زندگی کی اس کڑی اور تلخ حقیقت سے فرار حاصل کر رہے تھے جو اس وقت ان کے سامنے تھی۔ ایک طرف ترقی پسند تحریک تھی جو اپنے فن کو عوام کے دلوں میں پیوست ہو رہی

تھی اور جس نے ملکی اور قومی دھارے کو خود میں بہت حد تک رچا بسا لیا تھا!

سیاسیات میں دخل اندازی شروع کر دی تھی عوام کے دلوں کو اپنے جذباتی نغموں سے بیدار کر دیا تھا، جس میں مخدوم محی الدین، سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح، نجوم علی جواد زیدی، وامق جونپوری اور بہت سے شاعر تھے۔ جو اپنی تخلیقات سے عوام کو رومانیت سے انقلاب کی طرف لا رہے تھے اور جن میں یہ شعراء اپنے شعروں کی گرمی سے اُن میں ولولہ پیدا کر رہے تھے۔ دوسری طرف حلقۂ ارباب ذوق کی شاعری تھی جو یہ نعرہ لگا رہے تھے کہ ادب میں پروپیگنڈہ نہیں ہونا چاہیئے' ادب کوئی سیاسی پلیٹ فارم نہیں ہے۔ ادب کا زندگی سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے بلکہ ادب کا تعلق صرف ادب سے ہے اُس سے عوام سے کوئی مطلب اور سروکار نہیں، یعنی وہ لوگ فرد کی تنہائی اور فرد کی پریشانی اور فرد کے مسائل کو اپنی تخلیقات میں پیش کر رہے تھے اور ایک طرح سے ترقی پسند شعراء کا نہ صرف مذاق اڑا رہے تھے بلکہ وہ ان لوگوں کی شاعری کو شاعری بھی ماننے کے لئے تیار نہ تھے مثلاً فرقت کاکوروی نے اُسی زمانہ میں ملاوا لکھی۔ جس میں ترقی پسند شعرا کا بیحد مذاق اڑایا گیا! اسی طرح کی ایک تحریک تھی جو دھیرے دھیرے آگے تو بڑھتی رہی مگر عوام سے کٹ کر دائرہ سے ہٹ کر الگ تھلگ۔ کبھی وہ لوگ اپنی اسی شاعری سے جھنجھلا جاتے، کبھی دوسری حرکت کرنے لگتے مگر ترقی پسند مصنفین، عوام کے دلوں کو فتح کرتے اور عوامی مسائل کو اپنے موضوعات بناتے بڑھتے رہتے اور ادب کو صرف ادب نہ مان کر ادب کا زندگی سے رشتہ جوڑتے چلے گئے' اگر اس سماجی اور ادبی پس منظر میں سجاد ظہیر کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو کہیں کہیں وہ ہیئت کے اعتبار سے ترقی پسند نہیں معلوم ہوتے

تجربہ اچھی علامت ہے، تجربے ہر دور میں ہوئے ہیں اضافے بھی ہوتے ہیں اسلئے سجاد ظہیر کی شاعری کو پڑھتے وقت اگر موضوع کی طرف دھیان نہ دیا جائے تو اپنی ہیئت کی وجہ سے اور کبھی کبھی اوزان اور بحر سے بھی خارج نظر آتی ہے!

سجاد ظہیر ایک بڑے ادیب تھے، ایک بڑے ناول نگار تھے ایک بڑے صحافی تھے مگر انکی شاعری کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد سے اردو ادب میں جو ایک نئی تبدیلی رونما ہو رہی ہے اور خاص طور پر شاعری میں جو تجربے ہو رہے تھے ان سے سجاد ظہیر بھی اپنا دامن بچا نہ سکے! وہ بھی ہو لئے تیز بہاؤ میں یہ بھول گئے کہ انکی بھاری بھرکم شخصیت پر یہ شاعری کچھ زیادہ موزوں نہ ہوگی کیونکہ انھوں نے خود اپنے پیش لفظ میں اس بات کا اقرار کیا ہے جو یہاں نقل کیا جا رہا ہے

فیض احمد فیض نے میری ان نظموں میں سے کچھ سنی ہیں
اور چند کو انھوں نے پسند کیا ہے ایک نظم کے بارے میں
ایک خط میں انھوں نے مجھے لکھا میں یہ جاننا چاہتا
ہوں کہ اس کا نسخہ ترکیب استعمال کیا ہے "

میرے نوجوان دوست راہی معصوم رضا نے از راہ کرم مجھ سے یہ نظمیں سنیں اور پھر انھوں نے بھی تقریباً وہی بات کہی جو فیض نے پوچھی۔ فیض اور راہی کے سوال سے یہ معنیٰ سمجھتا ہوں کہ مروجہ اردو شعر میں بحر، وزن اور ردیف سے ایک مخصوص آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ صدیوں سے ہم نے انکی پابندی کی ہے اور ان اصولوں کے مطابق کہی ہوئی نظموں کا نسخہ

ترکیب استعمال ہے" لیکن ان اصولوں کے مطابق کوئی نظم نہ کہی جائے تو پھر ان نظموں میں وہ شعری آہنگ کیسے پیدا ہوتا جو شعر کی ایک بنیادی حقیقت ہے۔

سجاد ظہیر کم از کم شعر میں بحر وزن و رکن کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ مگر جب وہ بحیثیت شاعر ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہمیں خود ہی اُن کے یہاں اس کا فقدان نظر آتا ہے، مثال کے طور پر اُن کی ایک نظم کے چند ٹکڑے نقل کئے جا رہے ہیں

ہونٹوں سے کم
گرم مہکتی سانسوں سے
نم آنکھوں سے
تم نے پوچھا
"کیا ہم سے محبت کرتے ہو
بس ایک حرف منہ سے نکلا

"ہاں"
کتنا معمولی
چھوٹا سا
یہ نامکمل لفظ ہے　(ہونٹوں سے کم)

اسی طرح اُن کی کئی نظمیں ہیں جن میں "شعریت" تو موجود ہے مگر ان میں کوئی خاص بات، کوئی نظریہ یا ایسی کوئی بات نہیں ملتی جو قاری کے ذہن کو تھوڑی دیر کیلئے متاثر کر سکے، جیسے "نہ جنین"، ایسی بھی گھڑیاں آتی ہیں، "محبت کی موت"، اور ایسی بے شمار نظمیں جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ اگر انھیں غور سے دیکھا جائے تب بھی کوئی بات کوئی کشش نہیں نظر آتی۔ سجاد ظہیر کی شاعری کو علامتی شاعری بھی مانا جائے تب بھی وہ ایسی علامتیں ہیں جو عام فہم نہیں ہیں

سجاد ظہیر کی شاعری کو پڑھتے ہوئے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ فرانسیسی شاعر ملارمے سے متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ وہ بھی جسم کی تلاش سے زیادہ اس کے بھی ہیولوں سے آگہی کو پسند کرتا تھا۔ ابہام اور اشکال اسے بیحد پسند تھے۔ شعر میں الفاظ جس قدر غیر واضح ہوں گے اُسی قدر لطیف شاعری وجود میں آئے گی کیونکہ شعر گوئی محسوسات کی چیز ہے اسے عقل و دانش اور آگہی یا معلومات اور واقفیت سے کوئی سروکار نہیں، پھر وضاحت، حقیقی اور خالص شاعری کا خون کر دیتی ہے اس کا بہت مشہور جملہ اس سلسلہ میں یوں ہے

کسی چیز کی وضاحت اس کے تین چوتھائی لطف کو زائل کر دیتی ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی بات سے واقف ہونے میں کہیں بے انتہا لطف ملتا ہے

اگر مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں سجاد ظہیر کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی شاعری پر ملارمے کی شاعری کے اثرات بجا طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں یہ بات کچھ صحیح بھی ہے کہ انھوں نے اپنے اسکول کے زمانہ میں ہی فرانسیسی زبان کا مطالعہ شروع کر دیا تھا اور سید سجاد ظہیر کے ابتدائی زمانہ باز زمانہ شعور میں ملارمے کی شاعری فرانس کے ایک طبقہ کے لئے فیشن کی شاعری بن گئی تھی۔

اس لئے ہو سکتا ہے کہ انکی شاعری کا پڑھنے کے وہ نقوش لاشعوری طور پر ان کے خیالات میں سرایت کر گئے ہوں انہوں نے ملارمے کا اثر اگر شعوری طور پر نہیں تو لاشعوری طور پر ضرور قبول کیا ہوگا کیونکہ سجاد ظہیر بھی ملارمے کی طرح ہی الفاظ کو محض الفاظ اشارے ہی سمجھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید محمد عقیل " یہ ضرور ہوتا ہے کہ لفظ اپنے ساتھ تو چند تصورات اور خیالات وابستہ رکھتا ہے لیکن چند لوازم بھی جو لفظ کے گرد خیال کا ایک ہالہ سا بنا لیتے ہیں اور وہ کام موقع کے لحاظ سے اپنی شکل بدلتا جاتا ہے۔" اب اس روشنی میں سجاد ظہیر کی نظم "تصویریں" کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

ایک رنگ میں سینکڑوں رنگ ہوتے ہیں
ہلکے گہرے ، مدھم شفاف
روشنیوں سے بھرے ، کھلتے جگمگاتے
سرسبز آب ریشمی نقابیں ڈالے
دھوپ چھاؤں کی آنکھ مچولی کھیلتے
انوکھے نقوش میں ابھرے ، اڑتے ہوئے
یا پھر اتنے گمبھیر
جیسے جہازوں کے لنگر!
ان میں لہریں ہوتی ہیں
تڑپتی ، بے چین ، طوفانی
اور ایسی بھی
جن پر سکون کے سائے چھائے ہوتے ہیں

اس نظم میں ملارمے کے قول کی تصدیق ہو جاتی ہے اسی طرح کی انکی دوسری نظموں میں فرانس کے دوسرے شعرا کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سجاد ظہیر نے اپنی شاعری کے کینوس کو فرانسیسی شعرا کی نظر سے دیکھا ہے اور ملارمے کے بعد علامت نگاری کی تحریک کو آگے بڑھانے میں پال والیری تھا اور اس سے قبل وہ فرانس بھی کئی بار جا چکے تھے۔

پال والیری کا دور حیات ۱۸۷۱ سے جولائی ۱۹۴۵ تک ہے اور تقریباً یہی سال سجاد ظہیر کی زندگی کے بہت اہم سال ہیں ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند کا سنگ بنیاد ۱۹۳۸ء میں شادی اور ۱۹۴۰ء میں لکھنؤ جیل بھیج دئے گئے اور وہاں ۱۹۴۲ء تک رہے اور اس طرح اگر انکی شاعری کا مطالعہ اور انکی حیات کا مطالعہ سامنے رکھ کر کیا جائے تو اس امر میں کسی حد تک بڑی سچائی نظر آتی ہے کہ سجاد ظہیر لاشعوری طور پر فرانسیسی شاعری سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ کیونکہ والیری کے خیال کے مطابق۔ نظم ایک پیچیدہ ، داخلی اور ذہنی عمل ہے یہ انسانی ذہن کی ایک ایسی کشمکش ہے جو خود شاعر نے اپنے اوپر طاری کی ہو۔ ایک دوسرے موقع پر نظم کو والیری نے ایک بھاری وزن سے مثال کیا ہے جیسے شاعر مختلف اور مختصر اجزا کی شکل میں رفتہ رفتہ کسی بلند چھت پر لے جاتا ہے اور پھر وہاں سے اس بڑے وزن کو اٹھا کر یکبارگی تماشائی کے اوپر پھینک دیتا ہے۔ والیری کے اس نظریہ کو سامنے رکھ کر سجاد ظہیر کی شاعری کا مطالعہ کریں تو انکی شاعری میں بھی والیری کے خیالات کی گونج

اور بازگشت بہت صاف سنائی دیتی ہے جیسے انکی نظم دریا

آؤ میرے پاس آؤ نزدیک
یہاں سے دیکھیں
نیچے ایک دریا بہتا ہے
دھندلی دھندلی سی تصویروں کا
خاموشی سے بوجھل
بھیر چھپائے تھرتھراتے چلتے
کناروں کے پہلو میں
بے کل — دکھی
اسے بھی نیند نہیں آتی

علامت نگاری کی ابتدا اور ارتقا کے سلسلہ میں ڈاکٹر عقیل صاحب کی کتاب میں جو کچھ مواد ملتا ہے اس کو مطالعہ کرنے کے بعد سجاد ظہیر کی شاعری میں نہ تو علامتیں ہی نظر آتی جیسے کہ جدت طرازی نہ پوری طرح سے نثری شاعری ہی کہا جا سکتا ہے تو پھر اُسے کیا کہا جائے، سجاد ظہیر صاحب کی شخصیت بطور ممتاز شاعر نہیں کہی جا سکتی!

سجاد ظہیر صاحب ترقی پسند تھے، اشتراکی خیالات رکھتے تھے مگر ان کی شاعری میں نہ ملکی و قومی مسئلوں کا ذکر ہے نہ رومانیت کا سوز و گداز ہے اور نہ ہی جدیدیت کی چیستان گوئی ہے!

انکی شاعری کی راہ متعین کرنا مشکل بھی ہے اور ناممکن کیونکہ انکی شاعری میں نہ صرف بحر وزن سے خارج نظمیں ہیں بلکہ کچھ تو ایسی ہیں جن کو نظمیں کہنا درست ہوگا بھی یا نہیں مثلاً "اوشا" کی کچھ سطریں ملاحظہ ہوں

اُشا
اوس جیسی خاموشی
تھرتھراتی
پیار کے پہلے بوسے کی طرح

اب اوس جیسی خاموشی اور پیار کے پہلے بوسے کی طرح کوئی تسلسل نہیں ہے نظموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ان میں تسلسل کا خیال کیا جائے اسی طرح کی بے شمار کمزور اور غیر منطقی نظموں سے پُر "پگھلا نیلم" شاعری کا ایک اچھا نمونہ نہیں کہا جا سکتا اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کلام سجاد ظہیر صاحب کا نہ ہو اطولانے شعرا پر طنزاً یا مزاحاً ایسی شاعری کر کے جدید شاعروں کو جواب دینے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان جیسے سنجیدہ اور ذی علم انسان کیلئے ایسی شاعری کی توقع نہیں کی جا سکتی!

سید حسن امام

سید سجاد ظہیر کی تخلیقات پر ایک طائرانہ نظر

انسانیت کے علمبردار، مظلوم و مقہور کی حمایت میں زندگی کی تمام آرام و آسائش کو ٹھکرا دینے والے جلیل القدر مصنف کی تخلیقات پر نظر ڈالنے سے پہلے میں ان کے کارناموں کے پس منظر پر ایک نظر ڈال لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آخر وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے ظہیر صاحب کو اُردو ادب کو ایک نیا موڑ دینے پر مجبور کیا۔ ان تخلیقات کا محرک کیا تھا۔ تحقیق کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سجاد ظہیر صاحب آکسفورڈ سے بیرسٹری کی ڈگری لیکر ہندوستان آئے تھے۔ وہ چاہتے تو ہندوستان کی اعلیٰ عدالت میں وکالت کر سکتے تھے! مگر انگلستان کی واپسی کے بعد اہلِ وطن کی بے بسی اور غلامی کی ذلت کو وہ برداشت نہ کر سکے وہ جذبہ جو دورانِ تعلیم میں پل کر جوان ہوا تھا وہ کئی گنا اور تیز اور جذباتی فضا میں کھل کر انگڑائی لینے پر مجبور ہو گیا۔ حالانکہ ان کے گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ مگر وہ اپنے ناز و نعم کے ماحول کو تیاگ کر اس قافلہ میں آ شریک ہوئے۔ جو وطن کی حصول آزادی کے لئے منزل کی سمت طوفان سے ٹکر لیتا ہوا بڑھ رہا تھا اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے انھیں ہندوستانی دانشوروں کو جگانے کیلئے تخلیق کا سہارا لینے پر مجبور کیا۔ چونکہ سجاد ظہیر صاحب کو اس بات کا مکمل احساس ہو چکا تھا کہ کسی ملک اور کسی قوم کا مستقبل اس کا تعلیم یافتہ طبقہ ہی ہوتا ہے۔ لندن کی رات دراصل ان ہی جذبوں سے سرشار منظر عام پر آئی

'لندن کی ایک رات'

مختصر مگر جامع، ایک رات مگر مستقبل کی ہزاروں راتوں میں شمع فروزاں اور قندیلِ رہبانی کی مانند رہبری کرنے والا یہ ناول نہ صرف سجاد ظہیر کا شاہکار ہے بلکہ ہندوستانی عوام کے گلے میں پڑے رہنے والے طوقِ غلامی کو توڑ پھینکنے کا عزم صمیم بھی ہے یہ ناول. ہر اس قوم کا کارواں ہوگا جو شمشیر و سناں سے کھیلنے کے بجائے طاؤس و رباب کے پرکشش نغمہ و طرب میں خود کو بھول چکی ہوگی۔ یہ ناول نہ صرف ہندوستانی طالب علموں کا المیہ ہے، جو کہ لندن میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جاتے تھے اور وہاں پہونچ کر وہاں کے پرپیچ اور رنگین ماحول میں کھو کر مقصد کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے، بلکہ انسانیت کا المیہ بھی ہے

چونکہ اس ناول کی اشاعت سے پہلے ظہیر صاحب نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈال دی تھی اور اس کے سرگرم کارکن کی حیثیت سے پہلے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشغول تھے تاہم ناول کے پیش لفظ میں یہ لکھنا کہ "اس کا بیشتر حصہ

لندن اور پیرس سے ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز پر لکھا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس بات کا مکمل ثبوت نہیں ہو سکتا کہ انکی تصنیف ترقی پسند رجحانات سے متاثر ہے جیسا کہ قمر رئیس ہاشمی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ میں اس بات کو نہیں کہہ سکتا ہوں کہ ترقی پسندانہ طبیعت انہوں نے ازل سے پائی تھی ۔ ترقی پسند مصنفین کا یہ نصب العین رہا ہے کہ معاشرہ کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر نظر رکھی جائے اور حتی الامکان اس پر قابو پا یا جائے ۔ " لندن کی ایک رات " میں یہ نظریہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ترقی پسند مصنفین اپنی ہر تخلیق میں روٹی کپڑا اور مکان کے مسائل کو حل کرنیکی کوشش کرے۔

" لندن کی ایک رات " میں ان تمام کہانیوں کے نقائص کو بے نقاب کیا گیا ہے جو لندن میں داخل ہوتے ہی جوان طالب علموں میں داخل ہو جاتی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس رات کا پردہ فاش کرنے پر کچھ لوگ چیں بہ جبیں ہوئے ہونگے بھی جس کا موقع مصنف کو ملا ہوگا۔ مگر ایک حقیقت پسند ادیب دنیا کی چہ میگوئیوں کی فکر ہی کیوں کرتا ؟ اسکی نظر قدروں پر نہیں قوم پر ہوتی ہے

یہ ناول ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے ۔ چونکہ ناول کی تخلیق کے دوران جو حالت عالم دونوں قوموں کی تھی جو سیاسی تناؤ ، دونوں قوموں کے ذہنوں میں تھا اسکی بھی ایک جھلک بڑے ہی لطیف اور مدھم کن انداز میں ملتی ہے

برطانیہ اور فرانس سے واپسی کے قبل تک ظہیر صاحب ، سابقہ ان ممالک کے متعدد مصنفین سے پڑا تھا اور ان ادیبوں سے ان کے تعلقات کا اثر ، " لندن کی ایک رات پر " پڑا ہے ۔

" لندن کی ایک رات " جیمس جوائس کے " یولی سس " سے متاثر تو ہے لیکن ان دونوں میں صرف ایک اتفاقیہ مماثلت ہے ۔ " یولی سس " میں ڈبلن کا ایک دن ہے اور یہاں لندن کی ایک رات ۔ اسکی وجہ سے سجاد ظہیر کے ناول کو " یولی سس کا چربہ " سمجھنا یا کہنا نامناسب ہے ۔ بقول وقار عظیم " لندن کی ایک رات " یورپ اور انگلستان کے دیئے ہوئے فن کا ترجمان بن کر ہمارے سامنے آیا ہے اس میں جوائس کے یولی سس کا انداز بھی ہے " پروست کے لئے تقیاتی فن کا بھی " جوائس اور پروست کے اس اثر کا فنی مظاہرہ اردو ناول میں پہلی مرتبہ ہوا ہے ۔

" لندن کی ایک رات " کا ہر کردار فکر و احساس کے اعتبار سے اپنے آپ میں ایک مکمل اکائی ہے اس ناول کی سب سے پہلی کرداری کڑی اعظم ہے ۔ جو نہ صرف ایک بے حس اور لاپرواہ انسان ہے بلکہ ایک قابل رحم عاشق بھی اس کا دھرم ایمان سب کچھ عشق بازی ہے ۔ یہ پانچ پانچ گھنٹے " رسل اسکوائر " پر کھڑے ہو کر جین کا انتظار کرتا ہے حالانکہ موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے پھر بھی وہ پیر تسمہ پا کی طرح ان سے چمٹا ہوا ہے اور اگر اسے پانچ گھنٹے بعد بھی کوئی دن کی گھنٹی بجتی ہے تو معذرت طلب لہجہ لئے ہوئے ہیں اپنی خودداری کو اپنی نظروں میں قائم رکھنے کیلئے سوچنا شروع کیا کہ عشق میں ذلت اٹھانا دراصل ذلت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

یہ ہے اعظم کے سوچنے کا معیار ۔ اعظم اپنا وقت برباد کرنے میں بھی یکتائے روزگار ہے ۔ وہ دن بھر بیٹھا بیٹھا جین کے فون کا انتظار اور صرف انتظار کرتا ہے ۔ اسے امتحان سے زیادہ جین کی فکر ہے ۔ اعظم میں روٹھ جانے کی بھی بے پناہ صلاحیت موجود ہے گر جین کے گود میں بیٹھ کر گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اسکی رنجش طلب اور کرب انتظار کا غصہ کافور ہو جاتا ہے۔

راؤ نہ صرف ایک بہادر ، دلیر اور ہمت ور راجپوت ہے بلکہ ایک وطن پرست بھی ۔ اسے اس بات کا مکمل احساس ہے کہ دنیا میں عشق کے علاوہ اور بھی منزلیں ہیں اور بھی مسائل ہیں جن کے حل کیلئے انسان کو ہر شانے سے شانہ ملا کر چلنا ہے ۔

جب بھی ہندوستانیوں پر گولی چلنے کی، ان پر ظلم ہونے کی، کالے گوروں کے دست جبر و تشدد اٹھنے کی خبر ملتی ہے تو اس کا جذبۂ حب الوطنی نا سور کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے لہجے سے مدبرانہ شان جھلکتی ہے، اس کی نگاہوں میں دور اندیشی اور تجربہ کاری کی جھلک نمایاں ہے۔ ہندوستان سے سات ہزار میل دور رہ کر بھی اس کا دل ہمیشہ اہل وطن کے ہاتھ پر ٹکے ہوئے کینک کو مٹا ڈالنے کیلئے تڑپتا رہتا ہے۔ وہ قوم پرستی کا علمبردار ہے۔ اس کے دل میں ہندوستان کی کیساں قدر و منزلت ہے۔ وہ ہندوستان کو امن و امان کا گہوارہ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان میں مذہب کے نام پر پنپنے والی پارٹیوں ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ وغیرہ کا کٹر مخالف ہے۔

نسیم لندن سے والہانہ پیار کرتا ہے۔ وہ وہاں کی رنگین اور پُر بہار راتوں میں کھویا رہنا چاہتا ہے۔ وہ سست اور کاہل ازلی بھی نہیں ہے۔ دراصل لندن میں داخل ہوتے ہی اُسے یہ بیماری لگی ہے وہ ڈگری لینے آیا ہے پانچ ڈگری اور لے جائیگا کالی۔ اس لئے کہ وہ لندن سے کھیلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ وہ ایک خوش خلق اور ہمدرد انسان ہے نسیم کے سینہ میں بھی دل دھڑکتا ہے مگر وہ محبت کے الفت کدے میں واقف نظر نہیں آتا

مثلاً گرین کے ناول میں ایک نہایت سنجیدہ بے باک اور بردبار لڑکی کا کردار پیش کیا گیا ہے اس کی ایک ایک ادا سے سنجیدگی و متانت کا چشمہ پھوٹتا نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس کے جذبات مجروح ہیں اس کی محبت اور ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ پھر بھی آرام کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو سینے میں چھپائے ہوئے مسکرانے پر مجبور ہے وہ ہندوستانی نہیں ہوتے ہوئے بھی ہندوستانیوں سے محبت کرتی ہے، اسے ہندوستانی کھلونوں، ساڑیوں اور دیگر چیزوں سے بھی الفت ہے اور وہ اس لئے کہ اُسے ہیرن سے محبت ہے!

میں اپنے خیال کی وضاحت کیلئے اس کا یہ جملہ پیش کرنا چاہوں گا "وہ جنگلوں کا رہنے والا تھا اور وہاں آزادی اپنے نوجوان زیادہ دیر تک آزاد نہیں رہ سکتے۔ میرا دل ڈرتا ہے کہیں وہ گرفتار تو نہیں ہو گیا، نہیں لیکن میرا ہیرن کبھی مجرم نہیں ہو سکتا" مثلاً گرین کے یہ الفاظ صرف ہیرن سے محبت کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ہندوستانیوں کے متعلق ہمدردانہ رویے کی نشاندہی کرتے ہیں ______!

میری ہستی کا مقصد حل نہیں ہوتا تھا اور میں ایک بے لنگر اور بے بادبان کشتی کی طرح تیز و تند ہواؤں کے طوفان میں ادھر ادھر تھپیڑے کھاتی پھرتی تھی ......، یہاں اس کے احساس کا کرب صبر کی چادر کو چاک کرکے جھانک رہا ہے!

عارف جس مقصد سے لندن آیا ہے اس کو اس میں دلچسپی ضرور ہے مگر وہ یہاں کی فیشن ایبل اور زرق برق زندگی سے بھی محفوظ ہونے کی لگاتار کوشش میں مشغول نظر آتا ہے۔ عارف ایک خوبرو نوجوان ہے اسے اپنے خوب روئی پر فخر بھی ہے۔ وہ امریکہ اور فرانس کی بنی فلمیں اس لئے دیکھتا ہے چونکہ وہ ان چیزوں کی معلومات بھی آئی سی ایس کے امتحان کے لئے لازمی سمجھتا ہے۔ وہ لڑکیوں سے بلاجھجک باتیں کرتا ہے پھر بھی اسے اپنے مقصد کی تکمیل کی فکر ہے

کریمہ بیگم کی کردار نگاری اس بات کی بین دلیل ہے کہ سجاد ظہیر صاحب کو ہندوستانی عورتوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ تھا۔ لندن میں رہتے ہوئے بھی وہ اکثر ہندوستانی لہجوں میں چیخ چیخ کر باتیں کرتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹی بات

کہنے میں بھی وہ طوالت سے کام لیتی ہیں۔ انھیں ہندوستانی لڑکوں کا برطانوی لڑکیوں سے بے حجابانہ بات کرنا ذرا بھی نہیں بھاتا ۔۔۔۔
ان ہندوستانی لڑکوں کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ گورا چمڑا دیکھ کر آخر اپنے اوپر بالکل قابو نہیں رہتا سوا سفید چمڑے کے اس فرنگن میں کیا ہے
احسان ایک انقلابی کردار ہے ۔ وہ محنت کش طبقہ سے ہمدردانہ رویہ برتتا ہے ۔ وہ کورانہ قدامت پسندی
کا مخالف ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ انسانی دوستی کے صحیح معیار سے واقف ہو جائے ۔ وہ جب بھی بولتا ہے تو اس کے پیش نظر عالمی
برادری ہوتی ہے ۔۔ تم سب کے سب رئیس، بنیے، مہاجن، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، سرکاری نوکر جونک کی طرح
اور ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ ایسی حالت قیامت تک قائم نہ رہے گی۔ کسی نہ کسی دن تو ہندوستان
کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے!"
ایسا لگتا ہے جیسے سجاد ظہیر صاحب ظلمات کے افق سے پھوٹتی ہوئی ضیا کی کرنیں دیکھ رہے تھے اس طرح
انھوں نے جس انقلاب کی پیشین گوئی کی تھی وہ ہندوستان میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر رونما ہو رہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ افلاس، غریبی اور
فاقہ مری کی ناپاک چادر ملک کے جسم پر سے جلد ہی اترنے والی ہے
مندرجہ بالا کرداروں کے علاوہ بھی اور کچھ ذیلی کردار اس ناول میں شامل ہیں جن کو فراموش کرنا حقائق
کا خون ہوگا۔ اس سلسلہ کی دو کرداری کڑیاں جم اور شام ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس پس منظر میں سجاد ظہیر کا ترقی پسندانہ رجحان کارفرما ہے
دنیا کے مزدور ایک ہو کا والا نعرہ ہے۔ ان پر برطانوی کرداروں کو نہ صرف ہندوستان کی لیپا پوتی زندگی پر رحم آتا ہے بلکہ انسانی رنج و آلام
بھی انھیں اپنے رنج و آلام معلوم ہوتے ہیں۔ شام اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے جم سے گویا ہے ۔۔" میں نے خود اپنی آنکھوں
سے دیکھا ہے، غریب ننگے بھوکے جو کیڑے مکوڑوں کی طرح رہتے ہیں لاکھوں کروڑوں انسان مشکل سے تم کہہ سکو گے کہ وہ انسان ہیں۔ تم سے
میں سچ کہتا ہوں۔ ہمارے یہاں بیکار مزدوروں کی حالت ان سے بہتر ہے ۔۔۔۔۔۔ تم میری بات کا یقین مانو میں نے اپنی
آنکھوں سے ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر جگہ غربت ہی غربت دیکھی ہے "
جم شام کے ان جملوں سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے دل میں بھی ہندوستانی مزدوروں کے متعلق ہمدردی
کا جذبہ ابھرتا ہے !

" لندن کی ایک رات" کی تکنیک میں جدت اور تازگی ہے یہ پہلا ناول ہے جس میں اردو ناول نگاری
کو تکنیکی تجربوں کی لذت سے آشنا کیا۔ شعوری رو سے ہندوستانی ناولوں کو سجاد ظہیر صاحب نے ہی پہلی بار متعارف کروایا۔ فضا آفرینی
معاشرہ نگاری، واقعہ طرازی، مکالمہ نگاری اور کردار نگاری ناول کے پلاٹ سے اس طرح وابستہ ہیں جیسے ایک خوبصورت گلدستہ اور
گلدستہ ہمیشہ جاذب نظر ہوتا ہے اس کی خوبصورتی نہ صرف نظروں کو بلکہ دلوں کو بھی تازگی بخشتی ہے اس کا کوئی واقعہ، کوئی مکالمہ، کوئی
کردار غیر ضروری نہیں اور الگ سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ سب پلاٹ کی تشکیل اور ارتقاء میں کسی نہ کسی طرح معاون ہیں فنی
ساخت، اسلوبی تازگی اور موضوعی ندرت کے اعتبار سے سجاد ظہیر کے ناول میں پریم چند اردو ناول نگاری کے میلان سے کوئی ترقی یافتہ
تخلیقی شعور سے آگاہ کیا گیا۔
ایک فنکارانہ حیثیت سے سجاد ظہیر کی شخصیت کے چاروں طرف تنی بصیرت، فنکارانہ شعور

اخلاقیت و قیامت کا روشن ہالا سا نظر آتا ہے۔ سیاسیات نے اگر ان کو اپنی طرف راغب نہ کیا ہوتا اور انہاک و اطمینان کے ساتھ وہ ناول نگاری کی طرف متوجہ رہے ہوتے تو موجودہ دور کے سب سے اہم ناول نگار ہوتے۔

انگارے:-

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

یعنی جب ترقی پسند تحریک کی بات چھڑی تو سید سجاد ظہیر تک پہونچی اور جب ترقی پسند تحریک نے انگڑائی لی تو انگارے وجود میں آیا جس کے افسانوں نے ذہنوں میں ہلچل مچا دی! "انگارے" دس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں پانچ افسانے سید سجاد ظہیر صاحب کی ذہنی مصیبت کے کارنامے ہیں۔ ان افسانوں میں جو دو ٹوک حقیقت نگاری ہے وہ قدیم معاشرہ اخلاق و آرائش کے خلاف ایک حقیقت پسندانہ بغاوت ہے۔ بلکہ فرسودہ نظام کے منہ پر ایک زناٹے دار طمانچہ حالانکہ ان افسانوں پر کچھ تو مغربی افسانہ نگاروں کے مطالعہ کا اثر ہے اور اردو کے رومانی ادیبوں کی ان تحریروں کا جن میں فرسودہ اخلاقی نظام کے خلاف ایک انقلابی رومانیت اور شوخ بے باکانہ انداز نگارش ملتا ہے ان افسانوں نے سماج کے ٹھہرے ہوئے اصولوں کو متلاطم کر دیا! بقول وقار عظیم :- موضوع کے لحاظ سے اس سے پہلے اردو کے افسانوں میں اتنی صاف گوئی اور بے باکی نہیں ملتی اور نہ فن کے لحاظ سے اتنی نازک پیچیدگیاں۔ انگارے کے افسانہ نگاروں نے ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے راسخ عقیدوں کے خلاف ایسی باتیں کہیں جن کو کہتے میں اب تک لوگ جھجک محسوس کرتے تھے۔ لوگوں نے اب تک زندگی کے جن پہلوؤں کو دیکھ کر دیدہ و دانستہ چشم پوشی کی تھی۔ انگارے کے افسانہ نگاروں نے جسارت سے کام لیکر ان پر روشنی ڈالی۔ اس مجموعے کے افسانے فن کے اعتبار سے اردو میں آئے ہوئے تھے۔ نفسیاتی فن کے پیش رو اور فن کے ایک [illegible] کی راہ میں۔ موضوع اور فن دونوں میں ان افسانوں نے ایک ایسی بغاوت کی بنیاد ڈالی جس کے بغیر کسی [illegible] نہیں پہنچتا۔ گویا پریم چند کے دور تک بلا واسطہ افسانہ کہانی کا ایک سیدھا سادا فن تھا جس میں ہندوستانی دیہاتی زندگی [illegible] اور معاشی مسائل کی عکاسی براہ راست ملتی ہے لیکن انگارے کے بعد اردو افسانے بیسویں صدی کے پیچیدہ مسائل اور شہری زندگی کی وہ تمام نفسیاتی گتھیاں جن پر پریم چند اور ان کے ہمعصروں کی دسترس نہ تھی راہ پانے لگیں۔ مغرب کے اثر سے افسانوی تکنیک میں بھی متعدد تجربے ہونے لگے۔

سجاد ظہیر کی ان کہانیوں میں قصے کو پرانے انداز کو چھوڑ کر پلاٹ اور اس کی ترتیب کو بہت کم اہمیت دی گئی یہ افسانے اداسی، کرب، تشنگی اور جنسیات کی پیداوار ہیں جو اس دور کا نوجوان مذہب کے اخلاقی و معاشرتی قوانین اور اس سے پیدا شدہ الجھنوں کے خلاف محسوس کر رہا تھا ان افسانوں میں لب و لہجہ میں کہیں کہیں جھلاہٹ اور تمسخر پن تک پہونچ جاتا ہے، جھوٹی مذہبیت ریاکاری۔ تہذیب و شائستگی کا سوانگ وطن پرستی اور قوم پرستی کے ڈھونگ ان سب پر سجاد ظہیر نے طنز کے تیر برسائے ان کا جوانی کا جوش ہر چیز کو تہس نہس کر دینے کا جذبہ ہے اور یہ جذبہ کبھی کبھی اعتدال سے اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ ان کے مکالموں میں اور فقروں میں ابتذال اور عامیانہ پن آگیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں کا رد عمل شدید ہوا جس کے نتیجے میں یہ کتاب ضبط کر لی گئی۔ سجاد ظہیر کا افسانہ "دلاری" ایک تعمیری نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ اور سماج میں عورت کے متعلق پہلی بار بعض ایسی پیچیدگیوں کی طرف نشاندہی کی گئی ہے آگے چل کر بہت سے افسانہ نگار

نے اپنا مرکز بنایا اور نفسیاتی مطالعہ اور حقائق کے اسباب وعلل کا تجزیہ پیش کر کے اس اہم موضوع کو برتنے کی کوشش کی۔ پلاٹ سے مکمل آزادی اور باغیانہ خیالات کا اظہار نظر نہیں آتی۔ میں ہو اہے فنی اعتبار سے خام ہونے کے باوجود ہم ان کے ان افسانوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے چونکہ اس سے پہلے سماج کے بہت سے پیچیدہ اور اہم مسائل ابھی تک افسانوں کے حدود میں داخل نہیں ہوئے تھے ان افسانوں کو پڑھنے سے سجاد ظہیر صاحب کی افسانہ نگاری کی قدر دلوں کو محیط کرتی ہے

بیمار

ڈرامے عوام سے رابطہ قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے حالانکہ اب اردو میں ڈرامے اسٹیج کرنیکا رواج نہیں کے برابر ہے پھر بھی سجاد ظہیر نے ڈراموں پر طبع آزمائی کی ہے جس کے سلسلہ میں ان کے واحد ڈرامہ "بیمار" کا ذکر کرنا لازمی سمجھتا ہوں "بیمار" انہوں نے ۱۹۳۴ء میں لندن کے دوران قیام میں لکھا تھا سجاد ظہیر کا ڈرامہ "بیمار" صرف نام ہی کے لحاظ سے بیمار نہیں بلکہ فن اور موضوع کے اعتبار سے بھی بیمار ہے۔ مختصر یہ کہ سجاد ظہیر کے اس ڈرامہ پر مدعی سست اور گواہ چست - والاضرب المثل حرف بہ حرف صادق آتا ہے جس کی وضاحت اردو زبان کے سب سے بڑے ناول نویس اور افسانہ نگار جناب منشی پریم چند کی زبان میں ملاحظہ فرمایئے

"بیمار تنگ پڑ گیا۔ بیمار تمہارا ہیرو ہے لیکن کہیں اس کا کیرکٹر ظاہر نہیں ہوا اس کے سوا کہ وہ بیمار ہے اور ایک عزیز کے گھر پر بوجھ کی طرح پڑا ہوا ہے۔ وہ اگر اس سوسائٹی کے اصول اور برتاؤ کا قائل نہیں، اپنی سوسائٹی الگ بنانا چاہتا ہے عمر کا پیتا ہے تو اسے کا کچھ تو عملی اظہار کرنا چاہیئے محض زبانی اعتراکیت سے کیا حاصل میں ایسے نوجوانوں کو جانتا ہوں جو مجلس میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ سب کچھ ہیں مگر جو اں مردی دکھانے کا موقع آتا ہے تو حرم سرا میں روپوش ہو جاتے ہیں" بیمار کو اس طرح ناظر کے سامنے آنا چاہیئے کہ اس سے ہمدردی ہوتی ہے۔ اور بیلی ہی بے انصافی بیمار کی نظر آتی ہے زبان شستہ اور میاں بیوی کا مکالمہ بالکل فطری ہے

نقوشِ زنداں

مکاتیب میں سجاد ظہیر کی کتاب "نقوشِ زنداں" کافی اہمیت رکھتی ہے سجاد ظہیر کے ان خطوط کا تعارف کراتے ہوئے جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں!

"رسم ازدواج کی بڑی خرابیوں میں سے ایک عبرتناک خرابی یہ ہے کہ اس رسم کے وجود میں آتے ہی عورت کا حسن عدم کی جانب گامزن ہونے لگتا ہے۔ شادی کے زیر سایہ رومان کی سہانی چاندنی، سہ پہر منزل کی کڑی دھوپ میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ عورت کے حریم ناز سے خارج اور باورچی خانہ میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ خدا طور کو نان و تنور کی شکل اختیار کرنی پڑتی ہے لیکن ہر کلیہ میں ایک استثنا رپایا جاتا ہے چنانچہ سجاد ظہیر اس کلیے کی ایک نمایاں استثنا ہیں شادی کے باوجود ان کے دل میں اپنی بیوی کی محبت، شگفتگی و تازگی کے ساتھ موجزن ہے۔ ان خطوط میں وہ سب کچھ ہے جو عاشق و معشوق کے خطوں میں ہوا کرتا ہے۔ ان میں وہ حرارت، اصل وہ ہمہمہ اور وہ حیات پائی جاتی ہے

سجاد ظہیر کے ان خطوط سے جہاں ان کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے وہاں ان کی ادبی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے

روشنائی

سجاد ظہیر مرحوم نے ایام علالت میں ایک کتاب "روشنائی" لکھی ہے جو دراصل ایک ڈائری ہے یہ ڈائری

ان کے تمام تجربات و مشاہدات کی روداد ہے جو ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں حاصل ہوئی ہے اس میں بعض اشخاص کی مرقع نگاری بڑے ہی دلکش و دلفریب انداز میں کی گئی ہے اس کتاب کو پڑھ کر اشخاص و افراد کے کوائف کا بھی بخوبی علم ہو جاتا ہے اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ڈائری ہندوستانی ذہنیت و معاشرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں ہم ہندوستانی عوام کے مظلوم و مغموم عوام کے چہرے بخوبی دیکھ سکتے ہیں

پگھلا نیلم

مجھے بہ صد افسوس یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ بڑے بڑے نقادوں نے بھی سجاد ظہیر کی شاعری کو نظر انداز کیا ہے سجاد ظہیر صاحب ایک ترقی پسند نثر نگار رہی نہیں بلکہ ایک ترقی پسند شاعر بھی ہیں چونکہ وہ اپنی ہر نئی تخلیق میں اردو ادب کو کسی نئے تجربے سے روشناس کروانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں ۔ اسی کے پیش نظر آزاد نظموں کا انھوں نے ایک مجموعہ چاندنی کے پھولوں کی مانند ترقی پسند ادب کو سونپا ہے جس پر ہمیں نہ صرف غور و فکر اور ناز بھی کرنا ہے بلکہ ان کے تجربوں کے سہارے سمتیں متعین کرنی ہیں ۔ بقول اختر اورینوی) "شاعری الفاظ کی جمالیاتی ترکیب و اظہار کا نام ہے" کے مطابق شاعری قافیہ اور ردیف کی پابند نہیں رہ جاتی اس کے نقطہ نظر سے ان کی شاعری کو نظر انداز کرنا ایک رجعت پسندانہ اقدام ہوگا ۔ سجاد ظہیر صاحب فرماتے ہیں " ترقی پسند شعرا اگر ایک نظام کے خلاف غصہ اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں تو ان پہ یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شاعری کے دائرے سے باہر قدم رکھتے ہیں ۔ غصہ نفرت محبت بھی تو وہ جذباتی مادہ ہے جس سے شاعر اپنے خیال کا محسوس لفظی توازن کی شکل میں تیار کرتا ہے ۔ اگر سرمایہ داروں کو مٹانے کے لئے وہ مزدوروں اور کسانوں کے خفتہ جذبات کو جگانے میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو یہ اس کی شاعری کی کامیابی ہے"!

سجاد ظہیر نے اپنی آزاد نظموں میں اخلاقی قدروں کو سراہا ہے اور سماجی و معاشی نابرابری کو ختم کرنے کے لئے راہیں بھی نکال لی ہیں ۔ انسانوں میں جو اخلاقی گراوٹ ، نفرت و تعصب کا جو ناسور پل رہا ہے اس کے آپریشن کا طریقہ بھی بتایا ہے اس کی صحیح عکاسی کرتے ہوئے اس سے نمٹنے کے حربے سجاد ظہیر نے جس بارش میں دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ،

اے کاش ، دلوں میں ، روحوں میں ،
ایک ایسی بجلی بارش آئے
بیکار ذروں کے ڈھیروں پر
ہمت کی لہریں بکھرا دے
خود غرضی کے مندروں کو
اک جھٹکا دے کر الٹا دے

جا بجا لالچ کی پوٹلوں کو
جالوں کو ، جہل و کثافت کے
اور ظلم کی گندی سیڑھی کو

بچپن کا گھر کو متعصب کی،

تاراج کر دے، ناپید کر دے

یوں ختم کر دے۔ دل کی کھیتی

اسے جو پھر سب لہرا اٹھیں

گلزار شگوفے الفت کے

سوکھی جانوں سے پھوٹ پڑیں

اے کاش دلوں میں روحوں میں

ایسی ایک چنچل باڑھ آئے

جب شاعر خود کو غریبوں کی دنیا میں پاتا ہے تو اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے محلوں ہی میں رہنے والے جھونپڑوں میں آبسے ہیں۔ یہ نادار سرمایہ داروں کے قدموں تلے کچلے گئے فٹ پاتھ پر بسنے والے، غریب ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں ان ہاتھوں کو پھیلا رہے ہیں جن میں سب کچھ تھا

اب ہاتھ ہمارے خالی ہیں

اور سوکھے ہونٹوں سے ہمارے

ایک ہی لفظ نکلتا ہے

بخشش! بخشش،

سجاد ظہیر کی نظم "ماسکو میں تین" محاکات کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس محاکاتی کیفیت کو پیدا کرنے کیلئے ظہیر صاحب نے لفظوں کے استعمال میں بڑی خوش مذاقی دکھائی ہے، انھوں نے بعض مقامات پر نقاشی اور رنگ آمیزی کا کام کیا ہے اور وہاں ان کا قلم شاعر کے قلم کے بجائے مصور کا موقلم بن گیا ہے۔ الفاظ جو چند حروف کی اجتماعی شکلیں ہیں پگھل کر رنگ اور خطوط میں تبدیل ہو گئے ہیں اور صفحۂ قرطاس پر ایک منظر کشی کر گئے ہیں

..... جس جھنڈے کو لینن نے

کریملن میں گاڑا تھا

آج اسی جھنڈے کو لیکر

مل کے گاتے ہیں ہم

جینے کا حق مانگ رہے ہیں

اپنے دیش کو پیارا، اچھا سندر، سب سے پیارا دیس بنا دینے کا

ٹوکیو کے نیکھک، وِدیارتھی، جاپان کی جنتا

پوچھ رہے ہیں

• کیا کل ہم کو دنیا
ایک بار پھر
وہی جہنم تحفہ بھینٹ کرے گی
جس سے جاپان، باغ، پھول، بچے ہی نہیں
ایکبارگی جنگ سے جل اٹھے تھے
بلکہ معصوم روحوں میں بھی
آشا دیپک
اک جھٹکے سے بجھا دیئے تھے

یہ نظم امن عالم کے ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے، حسین منظر کشی، مکالمے کا حسن، زبان کی سادگی و پرکاری اس نظم کی اہم خصوصیتیں ہیں، محاکات کا ایک بہترین نمونہ پرانی دیوار میں ملتا ہے

کنول کی کلیاں
ہری ہری ساری پھیلائے
تیر رہی ہیں
اور فوارہ ہلکے ہلکے یوں چلتا ہے
جیسے صبح کو بالک
سوئی ماں کے ڈر سے
سسک سسک کر ہلکے ..... !

صنعتی تحریک نے دنیا کو جس درجہ مشغول بنا دیا ہے اس کا احساس بھی "پگھلا نیلم" میں بڑے ہی لطیف انداز میں ہوتا ہے اس کا خوبصورت اظہار اسلوب کی انفرادیت کے ساتھ ملاحظہ ہو

وقت کے لامحدود سمندر سے بس ایک قطرہ
اتفاقاً ہی فضاؤں کا صرف ذرا سا ٹکڑا
کتنے جتن،
کتنی صدیوں بعد
ملا ہے ہم کو

مگر شاعر کو اس بات کا خطرہ لاحق ہے کہ اتنی کش مکش اور اتنی کاوش کے بعد حاصل کئے گئے لمحے کہیں ظلم و عداوت کے رتیلے جھکڑ اس سے چھین نہ لے جائیں۔
محبت کا جو تصور ہونا چاہیئے وہ اب قائم نہیں رہ گیا ہے محبت اب تشنگی کی صورت اختیار کر چکی ہے!

اور صحرا صحرا بھٹک رہی ہے۔ سجاد ظہیر صاحب محبت کو ایک بار پھر سے اس کا حق دیکر اسے سارے عالم میں پھیلانے کی پرزور دعوت دے رہے ہیں

اور زخموں سے چور بیچاری محبت کو
رہا کر کے
پاسپورٹ اور کسٹم کی تلاشی کے بغیر
جیٹ ہوائی جہاز سے
اور راکٹوں سے بھی زیادہ تیز
دنیا کے سب ملکوں میں جانے
اور سب کے دلوں میں
گھر بنانے کی آزادی دے رہے ہیں ۔ ۔ ۔ !

بحیثیت مجموعی سجاد ظہیر صاحب ایک آتش بیان، وطن پرست غریبوں کے محسن و مددگار حق و انصاف کیلئے لڑ مرنے والے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک انسان بھی نظر آتے ہیں۔ انکی شاعری دراصل انکی شخصیت کا مظہر ہے۔ انکی کردار کی ایک ایسی خوشبو ہے جسکو بہ غور دیکھنے پر سارا عالم معطر ہو سکتا ہے ان کے ادب پاروں میں محبت کے ساتھ ساتھ کوئل کی کوک، پپیہے کی پی، بلبل کی نغمہ سرائی، پھولوں کی مہک کلیوں کی چٹک، آبشار کا بہاؤ، انسانیت کا ظہور، خیرگی، دھنک، تمناؤں اور آرزوؤں کی پرورش انکی تکمیل یا پھر حسرتناکی، مزدوروں کے پسینہ ریزی کر دنیا کی ساری رنگینی وخوشحالی جاری و ساری ہے اب یہ دور بین اور دور رس نگاہوں کا کام ہے کہ وہ ان چیزوں کو کب اور کہاں دیکھتا ہے۔ مگر افسوس

جس کی تابش سے پہنچتی تھی دلوں کو ٹھنڈک
اس پہ شب خوں کیا، وہ گل تر توڑ دیا

کاندید

سجاد ظہیر صاحب نے چند نادر و نایاب کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے جس میں والٹیر کی مشہور کتاب۔ کاندید قابل ذکر ہے۔ کاندید انسانوں کی ایک چھوٹی سی جلد ہے جسمیں ایک محدود دائرے میں اپنے عہد پر مشکل ترین طنز کیا گیا ہے۔ سجاد ظہیر نے اس افسانوی مجموعہ کا ترجمہ کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہوگا کہ یہ طنز اسی عہد تک مخصوص نہیں بلکہ عام انسانی سماج پر بھی طنز ہے اسی کی وجہ سے اس کتاب میں کچھ ایسی بات آگئی ہے کہ وقت اور ماحول کی تبدیلی اسکی خوبی کو کم نہیں کر سکتی۔

تب بھی ہم یہ نہیں بھول سکتے کہ اس دھیمے تازہ فکر کی ضرورت کا احساس پیدا کیا گیا تھا جو سماجی مسائل کو حل کرنے کے نئے طریقے دریافت کرنے یا اپنی تہذیب کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے باغ کی نشوونما میں مشغول رہے آپ کے پیش نظر سجاد ظہیر نے اپنے باغ کی نشوونما اور اس میں پھیلی ہوئی، اخلاقی برائیوں، سماجی نابرابری کو ختم کرنے کیلئے اس کتاب کو ہندوستانی عوام

کے سامنے رکھا تھا

تا صد ہزار خار دود یداز زمین
از گلبن گلی برگ تازہ می رسد

ذکرِ حافظ

ذکر حافظ ، سجاد ظہیر صاحب کا ایک تنقیدی کارنامہ ہے جس میں انہوں نے کسی بھی ناقد کو اس فرض کا احساس دلایا ہے کہ جب تک کوئی کسی شاعر کا بغور مطالعہ نہ کرے اس کو قلم نہیں اٹھانا چاہیے حافظ سجاد ظہیر صاحب کی نظر میں ایک حقیقت پسند اور سچی محبت کے پیروکار ہیں ۔ یہ تنقیدی مضمون سجاد ظہیر کی ناقدانہ صلاحیت کا غماز ہے ۔ غرض یہ ہے کہ سجاد ظہیر ایک شاعر ، ادیب ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن ہی نہیں ایک اچھے اور باصلاحیت ناقد بھی تھے

سجاد ظہیر صاحب کی تمام تخلیقات جن تک میری رسائی ہو سکی ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ انھوں نے اردو ادب کو ہمیشہ ایک نئی سمت سے نئے تجربے سے روشناس کرایا ہے ۔ دور حاضر کے قلم کار ..... انکی تخلیقات کی روشنی میں اپنے فن پاروں کو پیش کرنے اور ان سے مستفید ہونے کی لگاتار کوشش میں مشغول ..... ہیں اور مجھے اس بات کی توقع ہے کہ جنھوں نے اب تک انکی تخلیقات کا مطالعہ نہیں کیا ہے کم از کم ایک نظر ضرور دیکھ لیں ۔ مجھے یقین ہے کہ انکی تخلیقات کے مطالعہ کے بعد کوئی بھی انسان اپنی زندگی کو ایک اچھے اور نئے راستہ پر گامزن کر سکتا ہے ، سجاد ظہیر صاحب کی تخلیقات قلم کاروں کے لئے ہی نہیں بلکہ پورے سماج ، پوری انسانی برادری کیلئے ایک ایسی شمع راہ ہیں جن کی روشنی میں چلے بغیر کوئی بھی فرد اپنی منزل کو صحیح ڈھنگ سے پا نہیں سکتا اور نہ ہی عام کو تخریب عالم کے حملوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا ۔



عالم تاب تشنہ

سجاد ظہیر!

اک چراغ اور سرِ بزم ہوا گل یارو
اک سر اور سرِ دارِ وفا نذر ہوا
قیدِ جاں سے ہوا آزاد لو اک اور اسیر
شجرِ وقت سے اک برگِ خزاں اور گرا
اور اک نجمِ سحر ٹوٹ گیا آخرِ شب
اور اک دستِ دعا سرد ہوا آخرکار
اور کم ہو گیا لو شورِ سلاسل یارو
اور اک حلقۂ زنجیر لہو میں ڈوبا
درد میں ڈوب گئی اور کچھ آوازِ جرس
ہو گئی دور لو کچھ اور بھی منزل یارو
مل گیا خاک میں اک لالۂ صحرائی اور
چل بسا لیلیٔ جاں اک ترا سودائی اور
اک گلگشتِ بہار اور ہوا وقفِ خزاں
اور اک گوہرِ نایاب ہوا گم یارو
اور اک صاحبِ دل محفلِ دل سے اٹھا
اور اک سوختہ جاں قریۂ جاں سے گزرا
آج لو ختم ہوا بابِ رفاقت اک اور
آج اس عہد کی آواز ہوئی گم یارو

Printed and Published by S. Kartar Singh Giani Printer and Publisher, at Razaki Press, Kanpur and issued office of Gango-o Jaman, Flat No. 16, Naveen Market, Kanpur-208 001. Cover printed at The Kanpur Times Pre dited by 'PAYAM' Fatehpuri.

[illegible] with the Registrar of Newspapers in India vide No.: "R. N. 26706/75."

Regd. L. KP-CLLY-300